اسلام کا معاشیاتی نظام

حیدر زماں صدیقی

کتاب منزل لاہور

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

سلسلہ مطبوعات نمبر ۵۶
بار اوّل .... نومبر ۱۹۴۹ء
بار دوم .... دسمبر ۱۹۵۰ء

قیمت فی جلد .... دو روپے
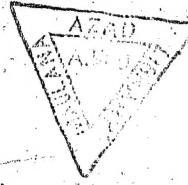
شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کر
کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا

فہرس

مضمون

تمہیدِ مباحث

اِسلام کا معاشیاتی زاویۂ نظر

اقوامِ عالم کی گوناگوں فتنہ آرائیوں کی وجہ سے نظمِ عالم ہمیشہ اختلال و فساد کی آماجگاہ بنا رہا ہے اور آج بھی شورش و بدامنی کی طوفانی لہروں نے امنِ عالم کو اپنے آغوش میں لے رکھا ہے۔ بلکہ کائناتِ انسانی جس طرح آج زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کی مثال انسانی تاریخ کے کسی دور میں مشکل سے مل سکتی ہے، خدا کی مقدس زمین انسانی خون سے لالہ زار بن چکی ہے۔

اس کے اسباب و علل کا احاطہ اگرچہ مشکل ہے مگر اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ ان اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یا علت العلل، خواہشاتِ مفرطہ کا ہجوم اور طرزِ معیشت کی بے ہنگامی، بدنظمی اور بے ضابطگی ہے، یعنی افراد اور جماعات کسی ضابطۂ معیشت (اکنامک گورنیشن (ECONOMIC

(REGULATION) اور اخلاقی قدر (MORAL VALUE) کی پابند نہیں ہیں اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین (IDEA) وسائل معیشت کی طلب و جستجو ہے۔ اور ان کے مدرسۂ فکر (SCHOOL OF THOUGHT) کی غایت الغایات ہوائے نفس کی تکمیل اور پیٹ کے مسئلہ کو حل کرنا ہے اور اس راہ میں وہ کسی ضابطۂ اخلاق اور مابعد الطبعی نظام کی پابندی برداشت کرنا نہیں چاہتے بلکہ تمام جائز اور ناجائز ذرائع سے استفادہ کرنے میں ان کو کسی طرح کا تامل نہیں ہے کیونکہ دولت کی فراہمی ہی جب مقصود بالذات ہے تو اس کے لیے یہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ شراب کے ٹھیکے فروخت کرنے سے حاصل ہوتی ہے یا سینما اور دوسرے مخرب اخلاق ذرائع پیداوار سے !

چونکہ قومی حکومت (نیشنل سٹیٹ) کا بقاء و تحفظ اور اس کی فلاح و بہبود ہی ان لوگوں کا آخری نصب العین ہے، اور ان کی ظاہر بین آنکھیں اس سے آگے کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے وہ اس مقصد کی خاطر غصب حقوق انسانی، ظلم و سفّاکی، قتل و غارت، وحشت و بربریت اور بہیمانہ خونریزی کو جائز ہی نہیں بلکہ نیک اور مستحسن کام تصور کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جن حکومتوں کو "اسلامی حکومت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی یہ ساری چیزیں جائز ہیں۔ شراب اور افیون کے ٹھیکوں کی خرید و فروخت، سینماؤں کا اجراء و البقا، اعلیٰ فلموں کی قصیدہ خوانی، نوجوان عورتوں کی نمائش اور اس طرح کے تمام اخلاق سوز اور شرمناک افعال اس لیے جائز ہیں کہ ان سے ہماری

قومی مملکت یا " اسلامی حکومت " کو فائدہ پہنچتا ہے

ع - بت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند

غرض آج دنیا میں نیشنلزم کے تباہ کن اثرات نے خدا کی زمین کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ آج تک کروڑہا انسانی جانیں اس کے آستانۂ غرور کی نذر ہو چکی ہیں اور کروڑوں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اور یہ دعویٰ یقیناً صحیح اور درست ہے کہ جب تک قومیت کے اس خود غرضانہ تصور کا دنیا سے خاتمہ نہیں ہوتا امنِ عالم کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

فان تنتج منها تنتج من ذی عظیمة الا فانی لا اخالك ناجیاً

خواہشاتِ مفرطہ کا ہجوم اور معاشی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی بہیمانہ جد و جہد نیشنلزم ہی کا کرشمہ ہے بلکہ قومی مقاصد کے لیے تمام جائز اور ناجائز ذرائع پیداوار کے اخذ و اختیار کی مجنونانہ خواہش بھی اسی کا شاخسانہ ہے، لہذا بہیمیت اور درندگی کی اس دنیا کو اگر دیانت و امانت، امن و راحت اور خیر و برکت کی دنیا بنانا مقصود ہے، تو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ اقوامِ حاضرہ نیشنلزم کے تنگنائے سے نکل کر اسلام کے دائرۂ اخوتِ انسانی میں قدم رکھیں اور نسلی گروہی اور جغرافی تصوراتِ قومیت کو چھوڑ کر اسلام کی ہمہ گیر برادری میں شامل ہو جائیں، اس سے محدود نسلی اور وطنی قومیتوں کی رقیبانہ کوششیں خود بخود ہی ختم ہو جائیں گی، اور معاشی کشمکش کے ہولناک نتائج سے دنیا کو نجات مل جائے گی۔

موجودہ معاشی بے راہ روی اور افراط و تفریط کی اصل وجہ یہی ہے کہ

آج کا انسان مذہبی احکام، عقل و شرع کی پابندیوں اور اخلاقی حدود سے بے نیاز ہوچکا ہے اور وہ معاشی دوڑ میں ہر طرح کے عقلی اور اخلاقی ضابطہ و آئین کی بندشوں کو توڑ دینے ہی میں اپنی کامیابی تصور کرتا ہے۔ مگر اس ظالم کو معلوم نہیں کہ اس قسم کی کامیابی سینکڑوں ناکامیوں اور ہزارہا مصائب کے لیے پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ موجودہ سول دار کی ہیبت ناکیوں نے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔ جن لوگوں کے گھروں میں سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے آج وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہیں، کل تک جو لوگ کروڑ پتی کہلاتے تھے آج ان کو سوکھی روٹی بھی میسّر نہیں۔ مگر تعجّب ہے کہ یہ قیامت خیز مناظر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے بلکہ خود ان سے دوچار ہونے کے بعد بھی اس فتنہ پرور انسان کی ہوس ناکیوں میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی اور اب بھی وہ بدستور سابق اسی ہلاکت خیز راستہ پر گامزن ہے بلکہ اس کی بہیمانہ خواہشات اور حرصِ دولت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ذوقِ معصیت اور انتہائی اخلاقی پستی جو پہلے اس قدر واضح نہ تھی اب پوری آب و تاب سے نمایاں ہوگئی ہے، حیرت ہے کہ ہلاکت و بربادی کے یہ بھیانک حادثات بھی ان کے دلوں میں رقّت و خوف نہیں پیدا کر سکے تو اس سے زیادہ وہ کون سی آزمائش ہوگی جس سے یہ لوگ عبرت و موعظت حاصل کریں گے۔ فیا للعجب!

۔ــــ اسلام کا نظامِ معاشیات الٰہیاتی تصوّرات اور خدائی فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اپنے ماننے والوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی اجازت

نہیں دیتا کہ وہ معین حدود سے ایک انچ بھی تجاوز کریں، بلکہ اسلامی نظریہ حیات انسان کے دل میں حفظِ حقوق انسانی معاشی حریت کے تحفظ اور خیر و شر اور حرام و حلال کی تمیز کا گہرا اور پائدار احساس پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی نظامِ معیشت انسان کے ذرائع آمد اور مصارف کو ایک خاص نظم (ڈسپلن) کے تحت رکھنا چاہتا ہے اور وسائل پیداوار کو الٰہیاتی اور اخلاقی بندشوں میں جکڑ دینا چاہتا ہے۔ بلکہ یہ چیز پورے اسلامی فلسفۂ اجتماع کی بنیادی قدر ہے، جو اس کے تمام شعبوں میں جاری و ساری ہے۔

صحاح کی ایک صحیح روایت ہے کہ قیامت کو ہر شخص سے تین سوال کیے جائیں گے۔ اور جب تک وہ ان سوالوں کا جواب نہ دے گا اس وقت تک اسے پاؤں پہ کھڑا رہنا پڑے گا۔ ان تین سوالوں میں سے ایک سوال یہ ہے

من این اکتسبہٗ و فیما انفقہٗ — زر و مال کہاں سے حاصل کیا اور پھر کہاں خرچ کیا؟

قرآن حکیم نے بھی کئی مرتبہ اس کی تاکید کی ہے

یاایھا الذین امنوا کلوا من طیبات ما رزقنٰکم (آیہ) — اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

اسی طرح اسلام میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کوئی شخص دوسروں کی معاشی حریت و آزادی پر اثر انداز نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے تمدنِ انسانی میں فساد و اختلال رونما ہو جاتا ہے، چنانچہ اسلام

نے صنعت وحرفت (انڈسٹری) زراعت (اگریکلچر) اور تجارت میں اس
بنیادی قدر کی رعایت کی ہے۔

ویشترط فی ذالک ان لا یفضی	معاشی وسائل کو ذریعۂ معیشت بنانے کی
بعضہم علی بعض بحیث یفضی	شرط یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی آزادی
الی فساد التمدن	معیشت پر اثر انداز نہ ہو کہ اس سے تمدنِ
(حجۃ اللہ البالغہ)	انسانی میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

غرض ہماری انفرادی اور شخصی معیشت ہو یا قومی اور اجتماعی، جب تک
آئینِ شریعت کے حدود و قیود میں مقیدؔ نہ ہوگی ہم پر نجات کی تمام راہیں مسدود
رہیں گی۔ کیونکہ خبیث اور طیب کی تمیز یعنی معیشتِ عادلہ ہماری سیرتِ ملّی
کا ایک جزوِ لاینفک ہے اور اس کی نفی ہماری قومی سیرت کے عدم کو مستلزم
ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لیے سرمایہ و دولت کی
ضرورت ہے، مگر اسلام میں سرمایہ کی ظاہری کثرت کا چنداں اعتبار نہیں بلکہ
اس کی معنوی کثرت زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔

لا یستوی الخبیث والطیب ولو	ناپاک اور پاک برابر نہیں ہوسکتے اگرچہ ناپاک
اعجبک کثرۃ الخبیث (آیہ)	کی کثرت آپ کو خوبصورت معلوم ہو۔

بلکہ ساز و سامان کی خواہش اور حرصِ دولت، ملّتِ اسلامیہ کی فطری شجاعت
و بسالت اور دیگر مردانہ صفات کے لیے زہرِ قاتل ہے ؎

سامان کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی مقصد ہے اگر منزل غارتگرِ ساماں ہو

مگر موجودہ مادّہ پرست انسان کو یہ کون سمجھائے کہ تمھارے مادّہ پرستانہ عزائم ہی نے عالمِ انسانی کو غرقِ آلام و مصائب بنا رکھا ہے۔ مگر اب بھی وقت ہے کہ تم اس گمراہی سے باز آؤ اور ظاہر سے زیادہ باطن کو سنوارنے کی سعی کرو۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا عادلانہ نظامِ معیشت ہی تمام ظاہری او رمعنوی محاسن کا حامل ہے اور اس کے سوا امنِ عالم کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے حکومتی نظام کو چلانے کے لیے ایک مستقل شعبۂ مال (فنانشل ڈیپارٹمنٹ) قائم کیا ہے اور حکومتِ اسلامی کے دائرہ عمل (دی سکوپ آف سٹیٹ اکٹوٹی) (THE SCOPE OF STATE ACTIVITY) کے اس اہم شعبہ کے لیے باضابطہ ایک جامع آئین بھی مرتب کر دیا گیا ہے اور حکومتِ اسلامی کے موارد و مصارف کو بالوضاحت بیان کر دیا گیا ہے۔ مگر وقت کی جدید ضرورتوں کے لیے اجتہاد و استنباط کا دروازہ بھی کھلا رکھا گیا ہے یعنی کتاب و سنّت کا فہم رکھنے والے اربابِ علم و عمل پیش آنے والے نئے مسائل کو اجتہاد کے ذریعہ حل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں اس مقصد کے لیے اہلِ علم و عمل کی ایک باضابطہ مجلسِ شوریٰ موجود تھی جو پیش آنے والے جدید مسائل کو کتاب و سنت کی روشنی میں حل کرتی تھی۔

میں نے اس کتاب (اسلام کا معاشیاتی نظام) میں متذکرہ مسائل پر بحث و تبصرہ کرنے کی سعی کی ہے اور امکانی کوشش کی ہے کہ اسلام کی معیشتِ عادلا کے اجزا، فکر و عمل کو بالوضاحت بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ حصولِ استقلال کے بعد اس امر کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے

نظامِ اجتماع و سیاست اور طریقِ معیشت میں اسلامی طرز کا انقلاب پیدا کیا جائے اور اس مقصد کے لیے جدید اسلامی لٹریچر کی ضرورت ہے۔

میں نے اس کتاب میں ہر چند اختصار کی کوشش کی ہے اور یہ دعویٰ کرنا یقیناً غلط ہوگا کہ یہ کتاب اس موضوع کے تمام مسائل پر حاوی ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اس طرز کی کوششوں کی ایک ابتدائی مثال ہے اور میری مخلصانہ خواہش ہے کہ ملک کے اسلامی فکر رکھنے والے اہلِ قلم اپنی اصلاحی اور قلمی کوششوں کو تیز تر کر دیں اور اس موضوع کے تشنۂ بحث پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں۔ دُعا ہے کہ خدائے قدوس میرے اس حقیر عمل کو شرف قبول بخشے اور مجھے بیش از بیش خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے۔

حیدر زماں صدیقی
ہری پور ہزارہ

موجودہ معاشی نظریات کا پسِ منظر

انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی مسائل میں اقتصادی مسئلہ کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اور اسی بنا پر موجودہ نظام ہائے حکومت میں اس مسئلہ کو اوّلین درجہ دیا گیا ہے اور ہر حکومت اپنی اقتصادی عظمت و برتری کی خاطر گوناگوں وسائل و ذرائع عمل میں لا رہی ہے۔ اور بظاہر یہ دعویٰ بھی بار بار دہرایا جا رہا ہے کہ ہمارے حدودِ مملکت میں کسی فردِ انسانی کو تنگ دست اور بھوکا نہ رہنے دیا جائے اور ملک کے تمام باشندوں کو امن و خوشحالی کے ساتھ مساویانہ زندگی بسر کرنے کی سہولتیں مہیا ہونی چاہئیں۔

مگر اس امر سے انکار حقیقت کا انکار ہوگا کہ حقیقی امن و خوشحالی صرف اس کا نام نہیں کہ دولت و زر کے انبار جمع کیے جائیں اور حکومت کے خزانے سونے اور چاندی سے بھرپور ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ موجودہ حکومتیں سرمایہ و دولت کے اعتبار سے تاریخ کے کسی دور سے پیچھے نہیں بلکہ ازمنۂ سابقہ سے بہر نوع اعلیٰ و برتر ہیں۔ موجودہ سائینس کے حیرت انگیز انکشافات نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا ہے۔ داعیاتِ نفس کے جملہ وسائل مہیا ہیں۔ عشق و محبت کی ہوس ناکیوں کی تکمیل میں کوئی امر مانع نہیں۔ حسن و جمال کی رنگینیوں سے فضائے عالم مہک رہی ہے۔ عیش

وعشرت ، زینت وتجمل اور آرام و آسائش کے وسائل کی بہتات ہے۔ مگر کوئی عقلمند انسان اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ جس چیز کا نام امن وسکون ہے روئے زمین کے کسی کونے میں اس کی کوئی ہلکی سے ہلکی جھلک بھی موجود نہیں بلکہ اس کے برعکس دنیا کے ہر حصّہ میں شورش وبدامنی کے طوفان اٹھ رہے ہیں ، بے چینی واضطراب کی بجلیاں لگاتار کوند رہی ہیں اور فتنہ و فساد کے شعلوں نے خرمنِ امن کو خاکستر بنا دیا ہے ، یہاں تک کہ کسی متنفس کو زندگی کے ایک لمحہ میں بھی سکون حاصل نہیں۔

ان حالات سے ہم ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آج عالم انسانی ایک بہت بڑے انقلاب کے دروازے پر کھڑا ہے ۔ زمانہ ایک نئی کروٹ بدلنا چاہتا ہے اور حیاتِ انسانی ایک نئی حرکت کا آغاز کرنے والی ہے ۔ مگر انسان کو اس وقت یقین ہوگا جبکہ وہ اس ہمہ گیر طوفان کی عبوری منازل کے بعد ایک نئی کائنات کا مشاہدہ کرے گا ۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (الآیہ)	ہم ان کو آفاق والنفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کو حق وصداقت کا یقین ہو جائے گا ۔

تاریخ انسانی کے ہر دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب کسی قوم نے لذات وشہوات میں بدمست ہوکر نوامیسِ فطرت کی توہین کی اور اس کی ظالمانہ قوت نے مخلوق خدا کو رنج والم میں ڈالا تو قدرت کی انتقامی قوتوں نے اس بدکردار قوم کے ناپاک وجود سے اپنی مقدّس زمین کو پاک کر دیا اور اس کے بعد کسی دوسری صالح

قوم کو اس زمین پر بسایا۔

کذالک واورثناھا قوماً اٰخرین (آیہ)

آج بھی اس بات سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اپنے مادّہ پرستانہ عزائم میں حدِ اعتدال سے بہت بڑھ چکی ہے اور جہاں تک مادّی عروج و ترقی کا سوال ہے، موجودہ دورِ انسانیت بہت حد تک منتہائے کمال کو پہنچ چکا ہے، مگر اس کے باوجود انسان کا ہر قدم جو آگے کی جانب اٹھتا ہے اس میں عالم انسانی کے لیے ہزارہا فتنہ سامانیاں اور ہلاکت خیزیاں موجود ہوتی ہیں تو کیا ان حالات میں کوئی عقل مند انسان اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ صرف سیم و زر کے خزائن ہی عالم انسانی میں امن و مساوات پیدا کر سکتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر ہمیں سوچنا ہو گا کہ آج ہمارے سماجی نظام میں کون سی قباحت پائی جاتی ہے جس کی موجودگی میں ہمارا ہر قدم ہلاکت و بربادی کو دعوت دے رہا ہے۔

اگر دولت سے مقصود انسانوں کی راحت اور امن و خوشحالی نہیں۔ بلکہ نفسِ دولت ہی ہے یا دولت صرف آتشیں اسلحہ کی نمائش اور قومی و نسلی رفعت و استیلا کا ذریعہ ہے تو یہ بدقسمت انسان قیامت تک چین کی نیند نہیں سو سکے گا اور قیامِ امن کی کوئی کوشش بار آور نہ ہوگی۔ مگر جہاں تک واقعات کا تعلق ہے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج صرف وطنی اور نسلی قومیتوں کی عظمت و برتری کے لیے سرمایہ و دولت کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ اور ہر ملک نے ان مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے دوسرے ممالک میں اپنی تجارت کا وسیع جال پھیلا رکھا ہے کہ ان خزائن کے ذریعہ ہوائی جہاز، ٹینک، ایٹم بم اور دیگر

ہلاکت آفریں اسلحہ جات وسیع پیمانہ پر تیار ہو سکیں اور اس طرح اندر ہی اندر اپنی فوجی طاقت کو ناقابلِ تسخیر حد تک مضبوط اور مستحکم بنا دیا جائے۔ اقوامِ حاضرہ کا یہ طرزِ عمل باہمی حسد و رقابت کی چنگاریوں کو ہوا دینے اور جذباتِ قومیت کو اُبھارنے میں جلتی پر تیل کا کام دے رہا ہے۔ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس آگ کے شعلے کب اور کس وقت امنِ عالم کو جلا کر راکھ کر دیں گے ؟

اس مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ موجودہ اقوام کے اقتصادی نظریات (اکنامک تھیوریز) کی اندرونی سطح جغرافی اور نسلی قومیت کے عصبیت آلود جذبات سے ملوث ہے۔ اور یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب تک ان اقوام کے بنیادی تصورات میں بیّن تبدیلی رونما نہ ہوگی اس وقت تک آنے والے خطرات کا کسی شکل میں سدِّباب نہیں ہو سکتا ۔ اور یہ تبدیلی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اقوامِ حاضرہ ان جغرافی اور نسلی قومیتوں کے تنگ دوائر سے نکل کر ہمہ گیر اخوتِ انسانی کے وسیع دائرہ میں قدم رکھیں اور ان کے قوائے ذہنی کی پرواز محدود خطہ ہائے ارضی کی قیود سے آزاد ہو کر روئے زمین کی وسعتوں پر چھا جائے۔ کیونکہ اس وقت انسان کی حقیقی نجات کے راستہ میں اگر کوئی بڑی رُکاوٹ ہے تو وہ اخلاقی اقدار اور ہمہ گیر اخوتِ انسانی کے علی الرغم انسانوں کی خود ساختہ نسلی اور وطنی تقسیم ہے۔ اور نہ صرف ان کے اقتصادی نظام میں بلکہ پورے فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) میں اس جاہلی عصبیت کا زہر سرایت کیے ہوئے ہے۔ انکی تہذیب ، آرٹ ، معاشرتی طرز و طریق اور سیاسی و معاشی نظریے ایک ہی اصل پر مبنی ہیں کہ ایک ملک کے باشندے یا ایک نسل کے افراد

ایک ایسی قومیت کی تخلیق کرتے ہیں جو دوسرے بنی نوع انسان سے کلیۃً الگ ہے اور اس کے اجتماعی تقاضے دوسری قومیتوں کے ملّی مفادات سے کسی وقت ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔

ظاہر ہے کہ ہر جغرافی قومیت جب تک اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے بالکل الگ تھلگ وحدت (یونٹی) تصوّر کرتی ہے اور اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کا سنگِ بنیاد ہی وطنی تصوّر ہے اس وقت تک ان متضاد اور متخالف قومیتوں میں کبھی اتّحاد نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کے قومی مفادات میں کبھی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، ہاں مفادات کا باہم تصادم اگر ختم ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ موجودہ طبقاتی (سیکشنل) تصوّرات کی جگہ اجتماعِ انسانی کی بنیاد شرفِ انسانی اور ہمہ گیر اصول و نظریات پر رکھی جائے۔ اور جب تک ان کے رجحانِ طبیعت اور اندازِ فکر میں یہ بنیادی تبدیلی پیدا نہ ہوگی اس وقت تک مفادات کی باہم ٹکر جاری رہے گی۔ کیونکہ اس صورت میں کوئی بھی ہمہ گیر صداقت ان کے پیشِ نظر نہیں ہو سکتی جو ان میں وجہِ اتّحاد بن سکتی ہو۔

اقوامِ حاضرہ کے اقتصادی نظریئے بھی اسی خود ساختہ تقسیم پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سیم و زر کے خزانے انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں بلکہ ان کی ہلاکت و بربادی کے کام آ رہے ہیں اور ان کے غیر فطری رجحانات نے ان کی مدنیت کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ — ہم نے بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کیں جو اپنی

مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلاً وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ (قصص) معیشت میں مغرور و متکبر ہو گئی تھیں اب یہ ہیں ان کے مکانات کہ ان کی ہلاکت کے بعد بہت کم آباد ہو سکے ہیں اور در حقیقت حقیقی مالک و وارث تو ہم ہی ہیں

اسلام کا اقتصادی نظریہ

اسلام کا نظریۂ زندگی اور فلسفۂ اجتماع کا دائرہ اثر و نفوذ روئے زمین کی ہمہ گیر وسعت میں پھیلا ہوا ہے اور اس وسیع دائرہ میں مرز و بوم، قبیلہ و نسل اور رنگ و زبان کے امتیازی خطوط کے لیے کسی طرح کی گنجائش نہیں بلکہ اسلام کا ہر اصول اور ہر نظریہ اپنی عالم گیر وسعت کے اعتبار سے دنیا کے تمام انسانوں میں ایک وسیع روحانی اور نظریاتی اخوت پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد میں وہ احمر و اسود، آقا و غلام اور عرب و عجم کی کوئی تمیز برداشت نہیں کرتا۔ یعنی اسلام کا دستورِ اخلاق، طرزِ معاشرت، نظریۂ سیاست اور فلسفۂ معاشیات وطنی اور نسلی قیود سے بالاتر اور انسانیتِ مطلقہ سے متعلق ہے۔ لہٰذا اسلامی اصول و نظریات ہی عالمِ انسانی میں ایک ہمہ گیر رشتۂ مودت پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اسلام کا آخری نصب العین بھی یہی ہے کہ تمام عالمِ انسانی کو ایک ایسی ہمہ گیر وحدت میں جذب کر دیا جائے جس کی بنیاد شرفِ انسانی اور ایمان و عمل پر ہو۔

کونوا عباد اللّٰہ اخواناً (بخاری) تم سب اللہ کے فرمانبردار بندے اور باہم بھائی بھائی بن جاؤ۔

اللّٰھم ربنا و رب کل شیء انا شھید اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار! میں اس

ان العباد کلهم اخوة   بات کی گواہی دیتا ہوں کہ انسان آپس میں
(ابوداؤد و مسند امام احمد)   بھائی بھائی ہیں۔

اسلام میں انسان کا اصلی مایۂ خمیر ایک ہی ہے اس بنا پر وہ انسانوں کی کسی مصنوعی تقسیم کو برداشت نہیں کرتا۔

الا کلکم من آدم و آدم من   تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم کو مٹی
طین   (مشکوٰۃ)   سے پیدا کیا گیا۔

آج دنیا کا انسان اس بات کو ماننے میں اگر ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے تو کرتا پھرے۔ مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس کے تردد کی وجہ سے قدرت کے اعمال و وظائف میں تعطل پیدا ہو جائے بلکہ اس کی خواہشات کے علی الرغم قانونِ قدرت (لاء آف نیچر) نے اپنا کام بہرحال جاری رکھنا ہے اور ایسا وقت آکر ہی رہے گا کہ اسلام اپنے نصب العین میں پوری طرح کامیاب ہوگا۔

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ   اللہ اپنے دینِ برحق کو مکمل کر کے رہے گا۔
(انفال)   اگرچہ کافر اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔

اسلام کے اقتصادی نظریئے (اکنامک تھیوریز) عالمگیر الٰہیاتی تصورات اور اخلاقی اقدار پر مبنی ہیں اور ان میں وطنی، قبیلوی، نسلی اور لسانی امتیازات کو کسی قسم کا دخل نہیں۔ ہاں اگر ان میں کوئی امتیازی پہلو ہو سکتا ہے تو صرف شرف انسانی اور مابعد الطبعیاتی تصورات کی بنا پر۔ یعنی حکومتِ اسلامیہ کے محکمۂ مالیات میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کا مقصد اس غرض کے لیے اسلحہ اور سامانِ جنگ تیار کرنا ہو کہ کسی دوسرے ملک کے انسانوں پر صرف اس وجہ سے حملہ کیا جائے

کیا جائے کہ وہ ہماری وطنی قومیت سے الگ ہیں یا ان کی نسل ہی ہماری نسل سے جُدا ہے، یا ان کا رنگ ہمارے رنگ سے متفاوت ہے، بلکہ اسلام ایک لمحہ کے لیے بھی اس قسم کے حملہ و ہجوم (اوفینسو) کی اجازت نہیں دیتا اور ہر ایسی جدوجہد کو قتال فی سبیل الطاغوت قرار دیتا ہے، ہاں اسلام صرف ہمہ گیر فلاح کے قیام کے لیے جہاد و قتال کا حکم دیتا ہے، اور وہ بھی اسوقت جبکہ کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں کے فرائض اصلاح انسانیت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتی ہو، اور درحقیقت اسلام ایک آزاد اور مختار اسلامی حکومت کے قیام کو صرف اسی لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس کے سوا کسی شکل میں قرآنی نظام اور اسلامی قانون (اسلامک لاء) کا نفاذ و اجرا نہیں ہوسکتا، ورنہ کسی دوسرے مادی مقصد کے لیے اسلام کو اقتدارِ حکومت کی قطعاً ضرورت نہیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آیہ)

وہ لوگ کہ جن کو اگر ہم زمین میں غلبہ و تمکنت عطا کریں تو وہ نمازیں ادا کریں، زکوٰۃ دیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کریں۔

متذکرہ آیت میں غلبہ و تمکنت فی الارض کو نماز، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قیود سے مقید کر دیا گیا ہے اگر قیام حکومت کے بعد حقوق خداوندی اور حقوق الناس کی کما حقہ ادائی نہ ہو اور حکومت کی طاقت نیکی کو اُبھارنے اور بُرائی کو مٹانے میں صرف نہ ہو تو ایسی حکومت اگرچہ اس کے چلانے والے اصطلاحی مسلمان

ہی کیوں نہ ہوں، اسلام کی نظر میں حکومتِ کفر سے مختلف نہ ہوگی کہ "اذا فات الشرط فات المشروط"

اسلام میں ہر ایسی جنگ جو اعلاء کلمۃ الحق اور دین کی برتری کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لیے لڑی جائے خواہ وہ محض اقتصادی جنگ ہو یا رشتہ و نسل اور جغرافی قومیت کے غلبہ و استیلا کے لیے ہو یا محض انتقامی جذبات کے تحت ہو وہ جاہلیت کی جنگ ہوگی اور اسے کسی حال میں اسلامی جہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن حکیم نے صاف الفاظ میں جہادِ اسلامی کی غرض و غایت متعین کر دی ہے۔

قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ — تم جہاد کرو یہاں تک کہ "فتنہ" مٹ جائے اور طاعت صرف اللہ کے لیے مخصوص ہو جائے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے "فتنہ" کی تفسیر ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

فقال هل تدری ما الفتنة ثكلتك امك انما كان محمد صلی الله علیه وسلم یقاتل المشركین وكان الدخول فی دینهم فتنة ولیس كقتالكم علی الملك۔ (بخاری کتاب الفتن) — حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا تم جانتے ہو کہ فتنہ کیا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے اس لیے جہاد کرتے تھے کہ ان کے دین میں داخل ہونا فتنہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح ملک کے لیے نہیں لڑتے تھے۔

اسی سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من خرج من الطاعة — جو شخص امیر کی طاعت سے باہر اور جماعت سے الگ ہو جائے اور پھر اسی حالت میں

وفارق الجماعة فمات مات ميتة جاهلية ومن خرج على امتي يضرب برها وفاجرها ولا يتحاشى من مومنها ولا يفي لذي عهدها فليس مني ومن قاتل تحت راية عمية يدعو الى عصبية او يغضب لعصبية فقتل فقتلة جاهلية ۔

(اخرجہ النسائی، کتاب المحاربہ)

مر جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی اور جو شخص میری امّت پر حملہ آور ہو اور نیک و بد کو قتل کرنے لگے مومن سے بھی نہ بچے اور جن لوگوں سے اس کا عہد ہے ان کی بھی پروا نہ کرے تو وہ میری امّت سے ہرگز نہیں۔ جو شخص کفر کے جھنڈے کے تحت لڑے، عصبیت کی طرف دعوت دے یا عصبیت کی خاطر غضبناک ہو اور پھر وہ اسی حال میں مر جائے تو اس کی موت جاہلیت و کفر کی موت ہو گی ۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام کا سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر اقوامِ حاضرہ کے طبقاتی نقطہ ہائے نظر سے بالکل مختلف ہے ۔ اسلام نفس انسانیت کی فلاح و نجات کا ضامن ہے اور وہ کسی طبقہ سے محض رنگ و نسل کی بنا پر جنگ چھیڑنا نہیں چاہتا اور نہ ہی کسی ایسے فرقہ پر محض اس حیثیت سے اقتصادی تفوق و برتری کا خواہاں ہے ۔ بلکہ اسلام دنیا کے تمام انسانوں کو نفس انسانیت کے اعتبار سے ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اور وطن و نسل کا اختلاف اس کی ہمہ گیر وسعتِ نظر کے آگے حائل نہیں ہوتا ۔

اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ صرف اسلامی نظریۂ اجتماع و سیاست کی بنیاد پر ہی ایک پائدار اور عالمگیر رشتۂ اخوت پیدا ہو سکتا ہے مگر جب تک ان اقوام کے اذہان و افکار میں فرق و طبقات کی سبقت و برتری کا جنون موجود

ہے اور ان کے سیاسی اور اقتصادی نظریات، تنگ نظری اور جاہلی عصبیت کے زہر سے آلودہ ہیں۔ اس وقت تک ان کی باہم اقتصادی اور طبقاتی جنگ بدستور جاری رہے گی۔

اسلامی نظریۂ معیشت کی نوعیّت

اسلام کا معاشیاتی نظریہ ہر لحاظ سے اقوامِ حاضرہ کے اقتصادی نظریات (اکنامک تھیوریز) سے مختلف ہے، اور ہر حیثیت سے بالکل جداگانہ اور مستقل بالذّات نوعیّت رکھتا ہے۔ اسے کسی دوسرے اقتصادی نظریہ سے ہرگز منسوب نہیں کیا جا سکتا، اور نہ کسی دوسرے نظریہ کی اس کی جانب نسبت کی جا سکتی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اسے کسی دوسرے نظریۂ اقتصاد سے کوئی معمولی سے معمولی تعلّق بھی نہیں۔

چونکہ یہ نظریہ ہر حیثیت سے مکمل اور مستقل ہے اس لیے یہ کسی دوسرے نظریہ سے گٹھ جوڑ کرنا نہیں چاہتا بلکہ یہ اپنے لیے بالکل ایک الگ مقام حاصل کرنا چاہتا ہے جہاں اس کے نفاذ و اجرا میں کسی بیرونی دباؤ کا ہلکے سے ہلکا شائبہ بھی موجود نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ نظامِ اشتراکیت (سوشلزم) اسلام سے قریبی نسبت رکھتا ہے کیونکہ اس کا مقصد بھی اسلام کی طرح انسانوں میں معاشی اور مجلسی مساوات قائم کرنا ہے۔ مگر یہ خیال ظاہر کرنے والے لوگ اسلامی نظریۂ معیشت سے قطعاً نابلد ہیں۔ ورنہ اسلام پر اتنا بڑا اتہام لگانے کی جرأت نہ کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے اشتراکیت کو کوئی ادنیٰ نسبت بھی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اسلامی نظریۂ زندگی اور فلسفۂ اجتماع احکم الحاکمین نے انبیاء علیہم السلام کے توسط سے انسانوں کو دیا ہے اور آفاق و انفس کے احوال و کوائف سے کسی انسان کو اتنی واقفیت نہیں ہو سکتی جتنی کہ ان کے پیدا کرنے والے کو ہے۔ کیونکہ خدائے قدوس کا علم ازلی انسان کے علم و نظر کی صلاحیتوں اور زمان و مکان کے نشیب و فراز کی ایک ایک حالت پر حاوی ہے۔ مگر انسان کی علمی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے ہی سود و زیاں سے آگاہ نہیں، چہ جائیکہ اس کا بنا ہوا نظام حیات تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری اٹھا سکے چونکہ خدا کا علم ہمہ گیر اور محیط کل ہے، اس لیے اس کا بھیجا ہوا نظام زندگی بھی اپنی مخصوص بناوٹ کے اعتبار سے لامکانی اور لازمانی ہے یعنی جس طرح یہ مرز و بوم کی بندشوں سے آزاد اور ہر ملک کی آب و ہوا سے مناسبت رکھتا ہے، اسی طرح زمانہ کا اُتار چڑھاؤ بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اور یہ بات کسی انسانی نظریہ میں موجود نہیں کیونکہ انسان کا علم ہر لحاظ سے ناقص اور کسی خاص ماحول میں مقید ہے۔

نیز اسلامی نظام اجتماع کے تمام اجزا باہم مربوط ہیں۔ ضابطۂ اخلاق ہو یا دستور تمدن، مذہب و روحانیت ہو یا معیشت و سیاست سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے جو ان تمام اجزا میں ہم آہنگی اور انضباط (ریگولیشن) پیدا کرتی ہے، یعنی نظام اسلامی کا کوئی شعبہ ہو، جب تک وہ اخلاقی قیود و اقدار کا پابند ہے اور مابعد الطبعیاتی تصورات و عقائد کا اس میں گہرا اثر

ہے تو وہ اسلامی ہے، اگر ایسا نہیں تو ڈھانچہ خواہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اس پر اسلام کا اطلاق کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ اس کی نسبت یہ کہنا بھی درست نہیں کہ وہ اسلام سے قریب ہے۔

اس لحاظ سے نظامِ اشتراکیت کے بنیادی عناصر کا تجزیہ کرنا چاہیئے کہ اس کی تہ میں کون سے عوامل کارفرما ہیں۔

نظامِ اشتراکیت کے عوامل

عوامل سے مراد وہ تصورات ہیں جو کسی چیز کے وجود کے محرک ہوتے ہیں، اور یہی تصورات اس چیز کے لیے اصل روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظامِ اشتراکیت کو جن تصورات نے پیدا کیا ہے، یا اس نظام کے ذریعہ جس نوعیت کا انقلاب بپا کرنا مقصود ہے اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے:

(۱) اشتراکی نظام (سوشلزم) مکمل طور پر انفرادیت محضہ (انڈی وجولزم) کی ضد ہے اور وہ انفرادیت کو کلّی طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔
افراد کی شخصی اور ذاتی ملکیت خواہ سرمایہ کی شکل میں ہو یا جائداد کی صورت میں اسے چھین کر سٹیٹ یا جماعت کی تحویل میں دینا چاہتا ہے۔
انفرادی جدوجہد اور ذاتی محنت کے حاصلات پر بھی سٹیٹ کو ہی قابض بناتا ہے۔ غرض معاشرت اور معاشیات کو کلیۃً جماعت کے تحت لانا چاہتا ہے۔

(۲) نظامِ عائلی میں تمام اخلاقی پابندیوں کو اٹھا دینا چاہتا ہے اور عورت کو ہر مرد سے اختلاط کی کھلی آزادی دیتا ہے نیز اولاد کو سٹیٹ کی ملکیت

قرار دیتا ہے۔ گویا نظامِ عائلی میں سلسلۂ ازدواج کو کلیتہً ختم کر دینا چاہتا ہے۔
(۳) مذہب کے تصوّر کو مٹا کر سوسائٹی کی بنیاد معاشی نظریوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔
(۴) ہر قسم کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے اور اس انتہا پسندانہ تصوّر کا نام ان کے نزدیک "کمیونزم" ہے اور جب تک یہ کام مکمل نہیں ہوتا حکومت کے تمام اختیارات ایک مطلق العنان اور منزہ عن الخطا ڈکٹیٹر کے حوالے کرتا ہے۔
(۵) ان مقاصد کے حصول کے لیے طریق کار یہ ہے کہ وہ ہر جائز اور نا جائز حربہ استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور اپنے ماننے والوں سے کسی اخلاقی پابندی کا مطالبہ نہیں کرتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ متذکرہ بالا امور خمسہ کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اسلام افراد کی ذاتی ملکیّت برقرار رکھتا ہے، اگرچہ فرد کو جماعت سے الگ ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسلام نے فرد اور جماعت کے حدود و دوائر متعیّن کر دئے ہیں کہ فرد کس حد تک اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتا ہے اور کس مقام پر اس کی انفرادیت جماعت کے وجود میں جذب ہو جاتی ہے یعنی اسلامی نظریۂ اجتماع اشتراکیت اور انفرادیت محضہ کے بین بین ایک معتدل اور درمیانی مسلک رکھتا ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرد کی ذاتی صلاحیتیں اُسی وقت اُبھر سکتی ہیں جبکہ اسے کام کرنے کی کھلی آزادی دی جائے اور اس کے دل میں اس کام کے لیے جسے وہ کرنا چاہتا ہے کشش موجود ہو اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے یقین ہو کہ میں اپنی محنت کے نتائج سے فائدہ اٹھا سکوں گا اور

آمدنی کو اپنی مرضی کے تحت صَرف کر سکوں گا۔ اگر اسے پہلے سے ہی یقین ہو کہ مجھے تو صرف صبح و شام کا کھانا اور پہننے کے لیے کپڑا ہی میسّر آئیگا تو اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ اپنی جان کو مصائب و آلام کی نذر کر دے۔ اور شوق و تندہی کے ساتھ محنت و مشقت اٹھائے۔ ہاں جب اسے یہ معلوم ہو کہ میں اپنی محنت کے نتائج کا واحد مالک ہوں گا اور اپنے منشا کے مطابق اسے اپنے ذاتی مصارف اور قومی و ملّی ضروریات میں خرچ کروں گا، تو یہ قدرتی بات ہے کہ اس کا شوقِ عمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا جائے گا اور اس کی قابلیت کے جوہر نمایاں تر ہوتے چلے جائیں گے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں انسانی زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے دو حصے ہیں۔ حیات قبل الممات اور حیات بعد الممات۔ گویا حیاتِ انسانی ایک غیر منقطع سلسلہ ہے اور اس میں ایک خاص قسم کا ربط پایا جاتا ہے۔ ہماری اس زندگی کی جد و جہد صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ بعد میں آنے والی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یعنی ہماری اس زندگی کی ہر حرکت کو آنے والی زندگی میں پورا دخل ہے، یہ عمل کی زندگی ہے اور وہ ثمرات و نتائج کی۔

اب ظاہر ہے کہ اس زندگی میں جب تک فرد کے تشخص کو برقرار نہ رکھا جائے اور اس کو اپنے اعمال میں آزادی نہ دی جائے۔ محاسبۂ اعمال کی کوئی صورت ممکن نہ ہوگی۔ انسانی اعمال میں عبادات اور معاملات یکساں طور پر شامل ہیں اور جس طرح عبادات کی تکمیل اور عدم تکمیل پر ثواب و عقاب، کا ترتب یقینی

ہے، اسی طرح معاملات میں بھی انسان کی ہر حرکت کا محاسبہ لازمی ہے، مگر اس صورت میں جب کہ فرد کی تمام تر جدوجہد کو انفرادیت سے نکال کر اجتماعیت میں گم کر دیا جائے اور فرد کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہنے دی جائے تو محاسبۂ اعمال کا تصور بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام بھی جماعتی زندگی کو لازمی قرار دیتا ہے اور فرد کو کسی حال میں اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی جماعت سے الگ ہو بلکہ جماعتی زندگی ہی اسلامی زندگی ہے اور انفرادی زندگی حیاتِ جاہلی کا دوسرا نام ہے۔ مگر اس کے باوجود اسلام میں فرد کے تشخص اور ذاتی اعمال میں اس کی خود ارادیت (سیلف ڈیٹرمینیشن) کو برقرار رکھا گیا ہے اور فرد کی اس حیثیت کے لیے اسلام نے الگ شعبے قائم کر دیے ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ فرد کے ذاتی اعمال بھی نتیجۃً جماعتی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ جماعت بھی اجزا افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔

نظامِ عائلی اسلامی زندگی کا ایک ناقابلِ تحلیل حصہ ہے اور اسلام کے فلسفۂ اجتماع کا ایک مستقل باب ہے اور اگر کچھ گہری نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت میں عائلی زندگی کی ترقی پذیر صلاحیتیں ہی سوسائٹی کی فلاح و ترقی کی ضامن ہیں اور ان سے اجتماعی زندگی کی شاہراہیں نکلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ازدواج کو زندگی کا ایک جزوِ لاینفک قرار دیا ہے۔ شوہر اور بیوی کے لیے الگ الگ دوائرِ عمل متعین کر دیئے ہیں اور ان کی مشترکہ ذمہ داریوں کو بھی بالوضاحت بیان کر دیا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ)

مسلمانوں کی وحدتِ ملّی کی بنیاد ہی مذہب پر ہے اور مسلمان صرف مذہب سے ہی دوسری اقوام و ملل سے ممتاز ہیں۔ مذہب کے سوا مسلمان کا کوئی وجود نہیں۔

اسلامی نظریۂ حیات کو بروئے کار لانے کے لیے خلافتِ ارضی اور اقتدارِ حکومت کی ضرورت ہے، اور جب تک ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم نہیں ہوتی، اسلامی احکام و قوانین کا اجرا و نفاذ ممکن ہی نہیں، یعنی حکومت و اقتدار اصل مقصد کے لیے ایک ضروری واسطہ ہے۔ اگرچہ خود مقصود بالذّات نہیں۔

اسی طرح اسلام میں کسی منزہ عن الخطا اور مختارِ مطلق ڈکٹیٹر کی گنجائش نہیں جس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات قانون کا حکم رکھتی ہو۔ اسلام میں خلیفہ خود تابع امر ہوتا ہے اور وہ نائب حق کی حیثیت سے خدائی احکام و قوانین کو نافذ کرتا ہے۔ اسے یہ حق ہرگز نہیں کہ وہ خدائی احکام میں اپنی طرف سے کوئی رد و بدل یا ترمیم کرے بلکہ اس کا فرض صرف اتنا ہے، کہ خدائی نظام کو اس کی اصل شکل میں نافذ کرے۔ نیز وہ ان احکام کا خود بھی اسی طرح پابند ہوتا ہے جس طرح وہ دوسروں کو پابند بنانا چاہتا ہے اور درحقیقت عام مسلمانوں میں جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا ہے وہی مسندِ خلافت کے لیے سب سے زیادہ اہل قرار پاتا ہے۔

اسلامی نصب العین کے حصول کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے اسے اسلام جہاد ہے اور جہادِ اسلامی کو اخلاقی بندشوں میں جکڑ دیا گیا ہے اور اس کی حدیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ نیز اس جدوجہد کے متنوع حالات کے لیے الگ الگ ضوابط مرتب کر دیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کی جدوجہد جب تک ان اخلاقی اور الٰہیاتی تصوّرات کی پابند ہے وہ جہادِ اسلامی کے مقدس نام سے موسوم ہو گی۔ اور اگر ان پابندیوں سے ایک انچ بھی باہر قدم رکھے گی تو وہ اسلامی جہاد نہیں کہلائے گی بلکہ فساد فی الارض یا قتال فی سبیل الطاغوت کے نام سے موسوم ہو گی۔

ان تصریحات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اشتراکیت اور اسلام میں کوئی نسبت نہیں اور جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سوشلزم اسلام سے مناسبت رکھتا ہے وہ ایک خطرناک گمراہی میں مبتلا ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موجود جاہلی نظامات میں اگر کوئی سب سے زیادہ مکروہ اور خطرناک نظام ہے تو وہ اشتراکیت ہے

"فاعتبروا یا اولی الابصار"

اشتراکیت کی حدرسائی

اشتراکیت کا آخری مطمحِ نظر انسانوں کی معاشی الجھنوں کو حل کرنا ہے اور ایک ایسی پرسکون اور آزاد فضا تیار کرنا ہے جس میں کوئی انسان اقتصادی اور معاشی اعتبار سے کمزور اور پس ماندہ نہ ہو اور کوئی ایک طبقہ ملک کے وسائلِ معیشت پر تنہا تسلّط نہ رکھ سکے بلکہ ملک کے ذرائعِ آمد سے ملک کا ہر باشندہ مساوی طور

پر فائدہ اٹھا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ طریق کار اختیار کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی پیداوار اور تمام کارکن قوتیں سٹیٹ کی ملکیت قرار دی گئیں۔

مگر اشتراکیین، جن تصوّرات پر جدید انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ محض منفی ہیں، یعنی عدمِ ملوکیت، عدمِ ملکیتِ ذاتی، عدمِ تشخص ذاتی، عدمِ تصرفِ ذاتی خدا و مذہب کی نفی، اخلاق و روحانیت کی نفی بلکہ آگے چل کر ہر قسم کی حکومت کی نفی، غرض اس نظامِ زندگی کی دفعات نفی سے شروع ہو کر نفی ہی پر جا ختم ہوتی ہیں ؎

"لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ"

حیرانی کی بات یہ ہے کہ حیاتِ انسانی بذاتِ خود مثبت چیز ہے اور مثبت کے لیے جو نظام مرتب کیا گیا ہے وہ از اوّل تا آخر منفیات کا مجموعہ ہے اور یہ ممکن نہیں کہ نفی کا یہ تسلسل حیاتِ انسانی کو نفی و عدم کی دستبرد سے بچانے میں کامیاب ہو جائے۔ انسانی زندگی جب خود مثبت ہے تو اس کی فلاح و ترقی بھی کسی مثبت نظام ہی سے ہو سکتی ہے۔

لا و الّا احتسابِ کائنات لا و الّا فتحِ بابِ کائنات
لا و الّا سازِ و برگِ امّتاں نفی بے اثبات مرگِ امّتاں (اقبالؒ)

اس سے قطع نظر انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ اس کی ترکیب میں ایک دوسرا جوہر بھی شامل ہے جو اپنی پُراسرار قوت کی وجہ سے جسم پر حکومت کرتا ہے اور جسم کی حس و حرکت کا سرچشمہ ہے، حیاتِ انسانی کے ان دو اجزا میں جس طرح کا ناقابلِ انفکاک ربط پایا جاتا ہے، اس کی فلاح کیلیے

اسی طرح کے ایک نظام حیات کی ضرورت ہے جو اپنی ترکیبی نوعیت کے اعتبار سے حیاتِ انسانی کے اجزائے ترکیبی سے مناسبت تامہ رکھتا ہو اور اس کے اجزا میں بھی اسی قسم کا گہرا ربط موجود ہو۔ ورنہ وہ کسی طرح انسانی ضروریات کا کفیل نہیں بن سکے گا۔

اس لحاظ سے اگر اشتراکی نظام کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا کوئی ایک جزو بھی ایسا نہیں جو ابعادِ جسم سے اُتر کر روح انسانی کے مقتضیات کی تکمیل کرتا ہو، اخلاقی اور مابعد الطبیعی تصوّرات کو تو وہ نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا اور خداوند تعالیٰ سے پیچھا چھڑانے میں ہی وہ انسان کی نجات تصوّر کرتا ہے۔ البتہ جسم کی راحت و آسائش اس کا انتہائی مطمح نظر ہے اور اس نے حیاتِ انسانی کی وسیع ضرورتوں کو سمیٹ کر ایک گھٹیا درجہ کی ضرورتِ انسانی کے تابع بنا دیا ہے۔ گویا انسانی زندگی کا منتہائے کمال یہی ہے کہ اس کے پیٹ کی آگ کے لیے ایندھن کی کوئی کمی نہ رہ جائے۔ مگر ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ حقیقی امن و راحت کا تعلق مادی خزائن کی کثرت اور وسائل معیشت کی بہتات سے اتنا نہیں جتنا کہ انسان کے قلب و نظر سے ہے اور جسمانی راحت، دل اور روح کی طمانیت و تسکین کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے لیے تو کسی اور ہی غذا کی ضرورت ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آیہ)

حقیقت یہ ہے کہ جب تک حیاتِ انسانی کے تمام اجزا کے ربط و تسلسل کو قائم نہ رکھا جائے اور اس کے ہر جزو کو اس کے اصل مقام پر رہنے کا موقع نہ دیا جائے۔ زندگی کے مسائل کسی شکل میں حل نہ ہو سکیں گے۔ اصل

میں فسادِ انسانیت کا سرچشمہ یہ ہے کہ زندگی کے کسی ایک جزو کو اس قدر اہمیت دے دی جاتی ہے کہ دیگر اجزائے حیات اس ایک جزو میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں یا دوسرے اجزاء کو اسی ایک جزو کے تابع بنا دیا جاتا ہے اور ان کی مستقل حیثیت سے کلیتہً پہلو تہی کر لی جاتی ہے۔ چنانچہ نظامِ اشتراکیت میں اقتصادی مسئلہ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ زندگی کے تمام مسائل یا تو سرے سے ختم ہو کر رہ گئے ہیں یا اس کے لیے تابع مہمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یک لخت تمام حیاتیاتی ضرورتوں کی علیٰ قدر المراتب رعایت کی گئی ہے اور حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اسلام کی نظرِ التفات سے محروم رہ گیا ہو۔ بلکہ ہر شعبہ کو اسی مقام پر رکھا گیا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کی نظریاتی خصوصیات

کسی نظریۂ زندگی کی عظمت و برتری کا معیار یہ ہے کہ وہ کہاں تک انسانی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے اور مختلف انسانی طبقات میں اس کا ردعمل کیسا ہے؟ دنیا کے مختلف نظریہ ہائے زندگی کے حسن و قبح کو اسی معیار پر پرکھا جا سکتا ہے۔

یوں تو ہر نظام کے موسسین کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا بنایا ہوا نظام انسانوں کی تمام مجلسی، معاشی اور سیاسی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر دعویٰ واقعیت، وحقیقت پر مبنی ہو، بلکہ جہاں تک شواہد کا تعلق ہے ہر انسانی نظام کی تہہ میں خود غرضی، تفریق و امتیاز اور ظالمانہ تفوق و برتری کے عوامل کارفرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج حریت و مساوات کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود انسان، انسان ہی کو نگل رہا ہے اور اپنے ہی ابناء نوع کے گوشت، پوست اور خون میں سب سے زیادہ لذت محسوس کرتا ہے۔ اگر حریت و مساوات یہی ہے تو پھر ہمیں یہ بتایا جائے کہ درندگی، سفاکی، وحشت و بربریت اور غصب حقوقِ انسانی کس چیز کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی طبائع کسی حال میں منفعتِ ذاتی اور غرض مندی کے عواطف وجذبات سے مبرّا نہیں ہو سکتیں، اپنی ذات انسان کو ہر چیز سے عزیز تر ہے اور اس کے بعد نسلی اور قبیلوی علائق اور پھر وطنی اور جغرافی

حدود کے اندر رہنے والے انسانوں سے اسے ایک خاص درجہ کا اُنس ہوتا ہے اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے مفادات کو دوسروں کی نسبت مقدم خیال کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس امتیازی طرزِ عمل کو خوبصورت اور دل کش پیرایۂ بیان سے حق بجانب قرار دے سکتا ہے اور اس کے لیے وہ عقلیت کا سہارا لے کر دلائل و براہین کے انبار لگا سکتا ہے۔ مگر قلبِ انسانی کی بڑھتی ہوئی خلش اور اس کے فلک شگاف نالہ ہائے درد کی روح فرسا صدائیں اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ ؏

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اور یہ کہ ان کے بنائے ہوئے دساتیرِ باطلہ عقدۂ انسانی کے حل کرنے میں بُری طرح ناکام ثابت ہوئے ہیں ؏

راہ بر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

چونکہ کوئی انسانی نظام طبقاتی اور نسلی احساسات سے مبرا نہیں ہو سکتا اس لیے وہ تمام انسانوں میں حقیقی مساوات قائم کرنے اور حیاتِ انسانی کی پیچ در پیچ گرہوں کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ مگر اسلامی نظریۂ اجتماع چونکہ خالقِ کون و مکاں کا بھیجا ہُوا ہے اس لیے اس میں کسی طبقہ یا گروہِ انسانی کی رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہر طبقہ اور ہر نسل کے انسانوں کے لیے اس کی افادیت یکساں ہے، کیونکہ اسلام میں انسانی وحدت کی بناء وحدتِ فکر پر ہے اور اس ہمہ گیر قومیت (انٹرنیشنلزم) میں علائقِ نسل و وطن اور عصبیاتی جذبات و احساسات کو قطعاً کوئی دخل نہیں، اسی بنا پر یہ دعویٰ یقیناً ہر صالح فکرِ انسانی کے لیے قابلِ قبول

ہوگا کہ اسلام کا سماجی نظام ہی نوعِ انسانی کو حقیقی امن، حریت اجتماع، مجلسی اور معاشی مساوات سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔

اسلام میں انسان کے معاشی حقوق کا احترام

اسلام کا نظریہ معیشت و تمدن

جس طرح حقوقِ انسانی کی نگہداشت کرتا ہے وہ اسلام ہی کا حصّہ ہے دنیا کا کوئی دوسرا نظام اس سلسلہ میں اس کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتا۔ یوں تو ہر سیاسی اور معاشی نظام حریت و مساوات کے بلند دعاوی کے ساتھ عالم وجود میں آتا ہے اور اس کی افادیت کے اظہار و بیان کے لیے خوش کن الفاظ و اصطلاحات کی پوری ڈکشنری مرتب کر لی جاتی ہے اور دلائل و براہین کے دفتر کھل جاتے ہیں مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج تک کوئی انسانی نظام انسانیت کے اصلی دکھ کا علاج نہیں کر سکا۔ اور انسان کی تشنہ لبی پہلے سے بھی تیز تر ہوتی جا رہی ہے بلکہ حریت و مساوات کے دعاوی باطلہ کے علی الرغم غریب انسانیت اسر و غلامی کے اغلال و سلاسل میں پہلے سے زیادہ نڈھال اور مضطرب نظر آتی ہے اور آج بھی دنیا کے کروڑہا انسان انتہائی محنت و مشقت اٹھانے کے باوجود نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ اس کی وجہ ایک اور صرف ایک ہے، کہ موجودہ نظریہ ہائے اجتماع میں ملوکیت و استبداد کی روح آج بھی کارفرما ہے اور اعلیٰ طبقوں میں اب بھی حرصِ دولت اور سرمایہ پرستی کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ اور پسماندہ طبقے ان کے ہاتھوں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں ؎

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است   نظامش خام و کارش ناتمام است

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم که در دینش ملوکیت حرام است (اقبال)

مگر اسلام کے نظامِ معیشت و اجتماع کی غایت انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات ہے اور وہ ایک طرف اعلیٰ طبقوں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور ان کے سفاکانہ عزائم کی نہایت معتدل اور مؤثر طریقہ سے اصلاح کرتا ہے اور دوسری طرف طبقۂ غربا کو ذلت و محکومیت کی پستی سے اٹھا کر عزت و شرف کی بلندی تک لے جاتا ہے۔

عرب میں انسانوں کا ایک ایسا گروہ تھا جن کو اشراف عرب نے انسانیت کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر رکھا تھا اور ان سے اس طرح کا سلوک کیا جاتا تھا جو آج تک ہندوستان کی اچھوت اقوام سے ہوتا رہا ہے، اور آج بھی ہو رہا ہے۔ اس گروہ سے میری مراد وہ انسان ہیں جن کو "غلام" کے حقارت آمیز نام سے پکارا جاتا تھا، مگر دنیا جانتی ہے کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس انسانی تفریق و امتیاز کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور عام اعلان کر دیا کہ نسلی شرافت اور قبیلوی وجاہت کوئی چیز نہیں، انسانوں میں اگر کوئی چیز وجہ امتیاز بن سکتی ہے تو وہ تقویٰ و طہارت، اور کردار کی بلندی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔

اے انسانو! ہم نے تم کو نر اور مادہ سے پیدا کیا اور تم کو کئی گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا مگر یہ اس لیے کیا گیا کہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو ورنہ اللہ کے نزدیک معزز ترین اور شریف ترین وہ انسان ہے جو تم میں سب سے زیادہ صاحبِ تقویٰ ہے۔

آقا اور غلام میں مجلسی اور معاشی مساوات پیدا کر دی گئی اور واضح الفاظ میں حکم دیا گیا کہ یہ تمھارے غلام نہیں بلکہ اسلامی بھائی ہیں، ان سے وہی سلوک کرو جو اپنے سگے بھائیوں سے کرتے ہو۔

عن المعرور قال لقیتُ اباذرٍ بالربذۃ وعلیہ حلۃ وعلی غلامہ حلۃ فسألتُہ عن ذالک فقال انی ساببت رجلاً فعیرتہ بامہ فقال لی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا اباذرٍ عیرتہ بامہ انک امرءٌ فیک جاھلیۃ اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس (بخاری)

معرور کہتے ہیں کہ میں ربذہ کے مقام پر ابوذرؓ سے ملا، انھوں نے ایک حلہ پہنا ہوا تھا اور ان کے غلام نے بھی اسی رنگ کا حلہ پہن رکھا تھا میں نے ان سے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک آدمی کو گالی دی اور اس کو اس کی ماں کا طعنہ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے ابوذر! تونے اس کو اس کی ماں کا طعنہ دیا ہے؟ تجھ میں اب تک جاہلیت کی خُو باقی ہے۔ یہ لوگ تمھارے خدمت گذار بھائی ہیں جن کو اللہ نے تمھارے قبضہ میں دیا ہے۔ جس شخص کے ماتحت اس کا بھائی ہو اسے وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی لباس پہنائے جو خود پہنتا ہے۔

یہ تو صرف غلاموں کی نسبت کہا گیا ہے، مگر اس کے علاوہ سرمایہ دار طبقوں کے غرور و پندار کو مٹانے اور عام غربا کو ذلت و پستی سے اٹھا کر عزت و شرف کی بلندی پر لے جانے کے لیے یہ حیات بخش پیغام دیا۔

ھَلْ تنصرون وترزقون الّا بضعفائکم (بخاری) اے طبقۂ امرا، غریبوں کے ذریعہ تمھیں ہر

قسم کی مدد اور خوراک ملتی ہے۔

آنحضرت صلعم نے اس مختصر مگر جامع فقرہ میں امیروں کے غرور و تکبر کو زبردست چیلنج کیا ہے کہ امیرو! تم کیا ہو؟ تم تو مخلوقِ خدا کے لیے بوجھ بنے ہوئے ہو۔ تمھیں کمانا اور محنت کرنا نہیں آتا، البتہ کھانا آتا ہے، سرمایہ و دولت جو تمھیں آباؤ اجداد سے وراثت میں ملی ہے یا تم نے خود مکر و فریب سے اکٹھی کی ہے اس کے ذریعہ تم غریبوں پر حکومت کرتے ہو اور ان کے خدا بنے بیٹھے ہو۔ مگر یاد رکھو تم گوشت اور پوست کے بیکار مجسمے ہو، اور تمھارا ہر سانس غریبوں کی جانفشانیوں کا رہینِ منت ہے۔ اس لیے تمھیں ان کے حقوق کا پوری طرح احترام کرنا چاہیئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی مقدس جد و جہد سے نہایت قلیل عرصہ میں ہر طرح کے طبقاتی امتیازات ختم ہو گئے اور انسانوں میں حقیقی مساوات پیدا ہو گئی۔

سرمایہ پرستی کی مذمت

اسلام نے دولت جمع کرنے اور اسے روک رکھنے کی شدید ممانعت کی ہے۔ کیونکہ جمع دولت ہی تمام مفاسدِ اجتماعیہ کا سرچشمہ ہے اور حرصِ دولت ہی سے خود غرضی اور حب النفس کا مکروہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو انسانی سوسائٹی کے لیے سم قاتل ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَهَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ۔ (توبہ)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے اے نبی آپ ان کو دردناک عذاب کی خبر دیں۔

مسلمان کا مقصدِ حیات اتنا بلند ہے کہ دولت وزر اور جسمانی راحتوں کے ساز و سامان اس کی نظر میں ایک ذرّہ برابر بھی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ مال و دولت فراہم کرتا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ اس کے ذریعہ غریب انسانوں پر جابرانہ تسلط قائم رکھے یا خود دولت کی پرستش کرے اور دوسروں سے اپنی پرستش کرائے۔

"تری المال عند الباخلین معبداً"

بلکہ اس سلسلہ میں مسلمان کا نقطۂ نظر بالکل الگ ہے کہ وہ اگر دولت حاصل کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے فرائضِ ملّی اور احکامِ مذہبی کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔ اور ساتھ ہی اپنی خودداری اور شرف النفس کو برقرار رکھ سکے۔ مگر اس کا دل حبِ دولت کی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے بلکہ وہ ہر ایسی محبت کو عشقِ الٰہی کے پُر خلوص جذبات کے لیے سخت مہلک تصوّر کرتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (بقرہ)	شہوات یعنی عورتوں، بیٹوں، سونے اور چاندی کے ڈھیروں، گھوڑوں، چارپایوں اور کھیتی کی محبّت دوسرے لوگوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صرف حیاتِ دنیوی کی متاع ہے۔

خدائے قدوس نے دنیاوی علائق سے قلبِ مومن کو آزاد کر دیا ہے اور اسے صرف خدا و رسول کی محبت کا گہوارہ بنا دیا ہے، اس لیے وہ دنیا میں

اگر کسی سے عشق رکھتا ہے تو صرف اپنے معبودِ حقیقی سے والدین، بیٹوں، بھائیوں، بیویوں، اموال و املاک اور سر بفلک عمارات کی محبت اسے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی جانب نہیں پھیر سکتی۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ)

اے نبی! آپ مسلمانوں سے کہدیں کہ اگر تمھارے والدین، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار اور وہ اموال جو تم نے حاصل کیے ہیں اور وہ تجارت جس کے خسارہ کا تمھیں اندیشہ رہتا ہے۔ خدا، رسول اور جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو تمھیں عذابِ الٰہی کا انتظار کرنا چاہیئے

اسلام میں دولت فی ذاتہٖ بُری چیز نہیں، اور نہ ہی اس کے حصول کی کوشش مذموم ہے بلکہ اس کی طلب و جستجو اور اس کے لیے سعی و عمل کو مستحسن قرار دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں دولت و مال کو خیر اور فضل کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۔ (سورہ بقرہ)

تم اپنی دولت سے جو خرچ کرنا چاہو تو اس کا بہتر مصرف والدین اور اقارب ہیں۔

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (سورۂ جمعہ)

تم اللہ کے فضل (مال) کی طلب میں نکل کھڑے ہو۔

احادیثِ نبوی میں طلب حلال کو نہ صرف مستحسن بلکہ اخروی درجات کا

بھی ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

اطیب الکسب عمل الرجل بیدہٖ وکل بیع مبرور۔ (اخرجہ احمد فی مسندہٖ والطبرانی فی الکبیر والحاکم فی المستدرک)	پاکیزہ تر کسب، انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور ہر ایسی بیع ہے جو دیانت سے انجام پائی ہے۔
انّ اللّٰہ یحب العبد المحترف (اخرجہ الطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی شعب الایمان)	اللہ تعالیٰ محنت و مشقت کرنے والے مزدور کو پسند کرتا ہے۔
من طلب الدنیا حلالاً استعفافاً عن المسئلۃ وسعیاً علیٰ اھلہٖ وتعطفاً علیٰ جارہٖ لقی اللّٰہ یوم القیامۃ ووجہہ مثل قمر البدر۔ (اخرجہ ابونعیم فی الحلیۃ)	جو شخص سوال سے بچنے اہل و عیال کی پرورش اور پڑوسی سے مروّت کرنے کی غرض سے رزق حلال کی خاطر سعی کرتا ہے وہ قیامت کو اللہ تعالےٰ سے اس حال میں ملاقی ہوگا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حصولِ دولت میں مسلم اور غیر مسلم کے نقطۂ نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غیر مسلم صرف مادی ضرورتوں کی تکمیل اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لیے مال حاصل کرتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا تصوّر اس کے ذہن میں نہیں ہوتا، مگر مسلمان کی زندگی کی ہر حرکت ایک بلند ترین نصب العین سے وابستہ ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے اور بال بچوں کے لیے محنت کرتا ہے تو اس کی یہ محنت جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ رکھتی

ہے۔

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشہداء یوم القیامۃ — سچے اور امین تاجر کا حشر قیامت کو نبیوں، صدیقوں اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔

(اخرجہ ابن ماجہ والحاکم)

ترکِ دنیا اور ترکِ وسائل کے راہبانہ تصور کو اسلام سے کوئی نسبت نہیں اسلام تو جہد و عمل اور حرکت و سعی کو انسان کے لیئے لازمی قرار دیتا ہے، اور جمود و سکون اسلام میں بدترین جرم ہے۔ مگر اس کے باوجود مسلمان کا دل خدا اور رسول کی محبت کے سوا کسی دوسری چیز کی محبت کو اپنے اندر جگہ نہیں دیتا اور اس کی زندگی کی ہر حرکت محبتِ الٰہی کے نقطہ مرکز کے گرد چکر کاٹتی ہے۔

اس بنا پر اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص یا جماعت دولت کی فراہمی ہی کو اپنا مقصد بنالے، اس کے خزانے دولت و زر سے بھرپور ہوں اور دنیا کی کثیر آبادی غربت و افلاس کے چنگل میں گرفتار ہو۔ یا آمدنی کے تمام وسائل پر چند اشخاص کا تسلط ہو اور دوسرے لوگ ان کی ناز برداریوں کے باوجود سوکھی روٹی کو بھی ترس رہے ہوں، یہی وہ حالت ہے جسے موجودہ اصطلاح میں سرمایہ داری (کیپیٹل ازم) اور اسلام میں اکتناز سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر اسلام نے اکتناز اور احتکار کی سختی سے ممانعت کردی ہے کہ اس سے دولت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ دراصل دولت کا مفہوم ہی اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ کسی ایک گروہ میں محدود نہ رہے، بلکہ تمام انسانوں میں پھیلتی اور بٹتی رہے۔

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم — تاکہ دولت چند سرمایہ داروں ہی میں نہ گھومتی رہے۔

اکتناز اور احتکار

اکتناز کے معنی ہیں سونے اور چاندی کے خزانے جمع کرنا، مگر اس طرح کہ ان سے حقوقِ خداوندی اور حقوق ملت ادا نہ کیے جائیں۔ اس تعریف کی بنا پر اکتناز صرف اسی صورت میں متحقق ہوگا جبکہ کوئی شخص اپنی جمع شدہ دولت سے متذکرہ حقوق ادا نہ کرتا ہو ورنہ بصورت دیگر اس کی اس دولت پر کنز کا اطلاق نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں نفسِ جمع دولت بُری چیز نہیں، بلکہ اسے اس طرح روک رکھنا کہ اس کے حقوق ادا نہ ہوں اکتناز کے تحت میں آتا ہے۔

عن ابن عمرؓ کل مال ادیت زکوتہٗ فلیس بکنز وان کان مدفوناً تحت الارض وکل مال لاتودی زکوتہ فھو کنز وان کان ظاھراً (موطہ امام مالک)	جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز نہیں ہوتا اگرچہ وہ زمین کے نیچے مدفون ہو۔ اور جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز ہے اگرچہ وہ سامنے پڑا ہے۔

اکتناز کی حرمت قرآن کریم کی نص قطعی سے ثابت ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۔ (توبہ)	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اے نبی دردناک عذاب کی خبر دیں۔

احتکار کے معنی ہیں اشیاء خورد و نوش کو نرخ کی گرانی کے انتظار میں روک رکھنا تاکہ ان سے زیادہ منافع حاصل کیے جا سکیں، مگر احتکار کو اگر کچھ وسیع

معنوں میں لیا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل امور بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ مال و دولت کو اس غرض کے لیے روک کر رکھا جائے کہ اس سے غلہ کی بڑی مقدار خرید کر کے اسے گراں نرخ پر فروخت کیا جائے، یا اس سے صنعتی کارخانوں اور دیگر وسائل معیشت پر تسلط حاصل کیا جائے۔ چنانچہ مؤطا امام مالک کی اس روایت میں احتکار کے یہی معنی لیے گئے ہیں۔

عن مالك ان عمر بن الخطابؓ قال لاحكرة في سوقنا لا يعمد رجال بايديهم فضول من اذهاب الى رزق من ارزاق الله نزل بساحتنا فيحتكرونه علينا۔

ہمارے بازار میں کوئی احتکار نہ کرے اجن لوگوں کے قبضہ میں ضرورت سے زائد روپیہ ہے وہ کسی غلہ کو جو ہمارے ملک میں آئے خرید کر اسے روک نہ دے یعنی احتکار نہ کرے۔

(الحكرة والتربص)

غرض اکتناز اور احتکار اگرچہ نفس مفہوم کے اعتبار سے جدا جدا ہیں مگر منشا کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں، اور سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کی اصطلاح ان دونوں کو شامل ہے۔ احتکار کی ممانعت میں متعدد احادیث و آثار وارد ہیں۔

عن عمرؓ الجالب مرزوق والمحتكر ملعون۔ (اخرجه ابن ماجه)

غلہ کو بیچنے کی غرض سے باہر لے جانیوالا مرزوق ہے اور احتکار کرنے والا ملعون ہے۔

عن ابي هريرة يحشر الحكارون وقتلة الانفس الى جهنم في درجة (اخرجها ابن عساكر وابن عدي في الكامل)

احتکار کرنے والوں اور انسانوں کو قتل کرنے والوں کو جہنم کے ایک ہی درجہ میں جمع کیا جائے گا۔

ان حقائق سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی روح "سرمایہ داری" کے سخت خلاف ہے اور اسلام کا منشایہ ہے کہ دولت کسی ایک انسانی گروہ میں مقید ہوکر نہ رہ جائے بلکہ عام انسانوں میں پھیلتی اور چکر کاٹتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام معاشی قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قانونِ وراثت، زکوٰۃ، عام صدقہ وخیرات کے احکام، سود اور احتکار و اکتناز کی تحریم میں ایک ہی روح کارفرما ہے اور ان قوانین پر عمل کرنے سے بتدریج انسانی سوسائٹی میں ہمہ گیر معاشی مساوات بروئے کار آسکتی ہے۔ مگر اس مقصد کے لیے اسلام کی راہِ عمل، عین انسانی فطرت پر مبنی ہے اور وہ سوشلزم کی طرح انسان کو اس کے حقوقِ ملکیت سے محروم کرنا نہیں چاہتا کہ اس سے انسان کے جذبۂ عمل و سعی کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور انسانی سوسائٹی میں اختلال و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

تحریمِ سود کی اصل وجہ

سودی کاروبار موجودہ اقتصادیات کا ایک ضروری حصّہ ہے۔ اور اس کو دولت کا سرچشمہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے اکثر مہذب ممالک میں وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار چل رہا ہے اور موجودہ حکومتی نظامات میں کوئی ایسا قانون نہیں جو سودی لین دین کو ممنوع قرار دیتا ہو بلکہ ہر ایسی مہذب حکومت اس کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اور خود بھی اپنی حدودِ مملکت میں اس کاروبار کو مختلف طریقوں سے وسعت دے رہی ہے حالانکہ سود اس ظالمانہ عہد کی یادگار ہے، جبکہ دنیائے انسانیت تہذیب و تمدن، علم و حکمت اور جمہوریت

ومساوات کی جہانتاب شعاعوں سے دورِ جہالت وغوایت اور ملوکیت و استبداد کے تاریک گوشوں میں روپوش تھی، مگر تعجب ہے کہ آج جبکہ دنیا کے ہر ملک میں حریت ومساوات کے روح پرور نغمے گونج رہے ہیں۔ یہ لعنت بدستور بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

چونکہ سود کا لین دین خود غرضی، انسان کشی اور انتہائی سفاکی کی ایک معاملاتی شکل ہے اس لیے اسلام نے اس کی حرمت قطعی کا حکم دیا ہے اور اخلاق ودیانت کا اقتضاء بھی یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کی عسرت وتنگ دستی کی حالت میں اس کی بے لوث اور بے غرضانہ خدمت کرنے سے قاصر ہے تو کم از کم اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ کیونکہ کوئی شخص انتہائی مجبوری کے بغیر سودی قرض لینا پسند نہیں کرتا۔ اور ایسی حالت میں شرافت واخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے شخص کے بوجھ کو ہر ممکن طریق سے ہلکا کرنے میں اس کی امداد کی جائے نہ کہ اسے اور زیادہ زیر بار کر دیا جائے۔

اسلام نے ایسی حالت میں قرض حسن کے ذریعہ ایسے شخص کی امداد کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اور قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ قرض دینے والے کا مقصد غریب بھائی کی امداد اور رضاء الٰہی کے سوا اور کچھ نہ ہو اور پھر اس قرض کے وصول کرنے میں بھی اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مقروض کی سہولت کا ہر وقت لحاظ رکھے اور اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالے بلکہ اگر اپنا واجب الوصول قرض معاف کر دے تو یہ اس کے اخروی درجات کا باعث ہوگا۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ اگر وہ شخص تنگ دست ہو تو ایک مدت تک

وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (سورہ بقرہ)

اسے مہلت دی جائے اور بالکل معاف کر دینا تو زیادہ بہتر ہے۔

امداد کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے مصیبت زدہ شخص کی کوئی چیز بطور رہن رکھ کر اسے حسب ضرورت رقم دے دی جائے۔ یہ بھی دراصل قرض حسن ہی کا دوسرا درجہ ہے، کیونکہ قرض دینے والے کو اس کی ہرگز اجازت نہیں کہ وہ مرہونہ چیز سے کسی قسم کا نفع اٹھائے کیونکہ یہ بھی اسلام میں سود ہی متصور ہوتا ہے۔

اس بنا پر قرآن حکیم نے نہایت شدت سے حرمت سود کا حکم دیا ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (بقرہ)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور بقایا سودی روپیہ بالکل چھوڑ دو۔ اگر تم سچے مومن ہو اور اگر تم ایسا نہیں کرنا چاہتے تو خدا اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنے کو تیار ہو جاؤ اور اگر تم یہ حکم ماننے کو تیار ہو تو تمہیں اصل سرمایہ کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔ نہ تم دوسروں پر ظلم کرو اور نہ کوئی دوسرا تم پر ظلم کرے۔

عام لوگوں کی نظر محسوسات سے آگے حقائق کی دنیا تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے ہر چیز کے ظاہری حسن و قبح یا سود و زیاں پر ہی ان کی نگاہیں جمی رہتی ہیں۔ مگر اہل نظر عالم محسوسات سے وراءالوریٰ ایک فوق العادت اور غیر محسوس عالم کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس بادۂ رنگین کی لذت وہی لوگ جانتے ہیں جنھیں کبھی اس کے چکھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ مادہ پرست دنیا اس کے کیف و سرور

کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی ؏

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی

اسی اعتبار سے قرآن حکیم نے سود اور زکوٰۃ کا ان الفاظ میں موازنہ کیا ہے:

مَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (روم)	تم جو اس غرض سے سودی قرض دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے اموال میں بڑھے تو حقیقت میں وہ بڑھتا نہیں۔ اور جو تم رضائے الٰہی کے حصول کے لیے زکوٰۃ دیتے ہو تو اس سے دولت میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔

اب جو لوگ محض سطحی نظر سے اشیاء کو دیکھتے ہیں ان کے نزدیک پہلی صورت میں دولت بڑھتی ہے اور دوسری صورت میں گھٹتی ہے۔ مگر خدا کے نزدیک ایسا نہیں، کیونکہ خدا کی نظر ہر چیز کے انجام اور نتائج پر ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام اخلاقی اور الٰہیاتی حدود و اقدار میں بندھا اور سمٹا ہوا ہے اور کوئی ایسا کاروبار جس میں سود، احتکار، رشوت یا کسی دوسرے امر ممنوع کا شائبہ بھی موجود ہو اسلام کی نظر میں حرام ہے۔ اور مسلمان کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ معیشت کی راہ میں پوری احتیاط سے قدم رکھے کہ کہیں اس کی محنت کے حاصلات میں حرام کی آمیزش نہ ہو جائے۔ ورنہ اس کا سب کیا کرایا اکارت ہو کر رہ جائے گا۔

وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ (بقرہ)	ناپاک مال کے حصول کا قصد نہ کرو کہ اس سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔

عن عمر قال ان اخر ما نزل من القرآن آية الربا وان رسول اللہ صلعم قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربا والریبة (اخرجہ ابن شیبہ واحمد وابن ماجہ وابن جریر وابن المنذر والبیہقی)

قرآن کریم کی آیات کے سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھا لیے گئے اور انھوں نے ہم سے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی۔ پس تمھیں ہر قسم کی ربا بڑی اور چھوٹی سے بچنا چاہیئے۔

عن الشعبی قال قال عمر ترکت تسعة اعشار الحلال مخافة الربا۔ (اخرجہ عبدالرزاق فی الجامع)

حضرت عمر نے فرمایا ہم نے ربا کے خوف سے حلال کے نو حصے بھی چھوڑ دیے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا معاشی نظریہ کتنا بلند ہے کہ وہ کسی انسان کی معمولی سے معمولی حق تلفی کو بھی برداشت نہیں کرتا بلکہ انسانی معاشیات کو خاص قوانین کے تحت چلانا چاہتا ہے تاکہ کوئی شخص اپنے سرمایہ کے زور سے دوسروں پر مشق ستم نہ کر سکے اور کسی کو غریب انسانوں کا خون چوسنے کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔

فریضۂ زکوٰۃ کی حکمت

لوگوں کی نظر میں چیز کی کثرت اور قلت کا دارومدار مقدار، حجم یا تعداد پر ہے۔ مگر اسلام کے نزدیک ہر چیز کی کثرت و قلت ایک غیر مرئی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر تھوڑی چیز میں معنوی عظمت موجود ہے تو وہ خدا کی نظر میں کثیر ہے۔ اور ایک چیز لوگوں کی نظر میں بظاہر بہت بڑی معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ معنوی عظمت سے محروم ہے تو خدا کے نزدیک وہ قلیل ہے۔ اور یہ چیز صرف تصورات ہی تک محدود نہیں بلکہ حقائق و واقعات کی دنیا میں سینکڑوں دفعہ اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے،

جس طرح پاکباز، صالح اور منظم انسانی گروہ انتہائی قلت کے باوجود دنیا کی بڑی سے بڑی اکثریت پر غالب آسکتا ہے، اور اس کی عددی اقلیت، اکثریت کا حکم رکھتی ہے۔ اسی طرح وہ صالح اور پاک مال جو نیک اور جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو اگرچہ بظاہر کم ہو مگر اس ان گنت دولت سے ہزار درجہ بہتر ہے جو غریبوں کا خون چوس چوس کر اکٹھی کی گئی ہو۔

لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ (مائدہ ۱۳) ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ ناپاک کی کثرت کتنی ہی بھلی معلوم ہو رہی ہو۔

جو غلہ غریب کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے سمیٹا جاتا ہے، جو دولت ہزارہا انسانوں کے وسائل معیشت پر غاصبانہ قبضہ جما کر اور بے کس مزدوروں پر ظلم کر کے جمع کی جاتی ہے، جو تاج کروڑوں انسانوں کے خونِ ناحق کے بدلے میں حاصل کیا جاتا ہے اور جو تخت بے گناہ نفوس کی کروڑوں لاشوں پر بچھایا جاتا ہے اس سے وہ قوت لایموت اور مردِ مومن کی گلیم کہنہ بہتر ہے جو حلال اور پاک طریقوں سے حاصل ہوتی ہے ؎

وہ قبا جس پہ ہوں دہقاں کے لہو کے چھینٹے
اس سے بہتر ہے کسی مردِ قلندر کی گلیم

یہی وہ مقدس جذبہ ہے جو مسلمان کے ہاتھ کو خونِ ناحق سے رنگین نہیں ہونے دیتا اور اسی جذبہ کو تقویت دینے کے لیے قرآن حکیم نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جو شخص اپنی ضروریات زندگی سے بچا کر چالیس روپے جمع کرتا ہے تو اس پر سال میں ایک مرتبہ ایک روپیہ مد زکوٰۃ میں دینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی طرح

اگر وہ ایک کروڑ روپیہ کا مالک بن جاتا ہے، تو سال میں اسے ۲½ لاکھ روپیہ دینا پڑتا ہے۔ اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جمع دولت کا وہ منحوس جذبہ جو نظام سرمایہ داری (کیپٹیلزم) کا محرک ہے اور جس سے ہزارہا مفاسد اجتماعیہ رونما ہوتے ہیں آہستہ آہستہ ختم ہوکر رہ جاتا ہے ؎

حب دولت را فنا سازد زکوٰۃ   ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حتیٰ تنفقوا محکم کند   زر فزاید الفت زر کم کند (اقبالؒ)

قرآن حکیم نے کس شان بلاغت سے اس مضمون کو ادا کیا ہے

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ   اللہ تعالیٰ سود اور جذبہ سرمایہ داری کو مٹانا اور صدقہ و خیرات اور اخوت انسانی کے مقدس جذبہ کو ابھارنا چاہتا ہے۔

انسان کا فہم ناقص بہت سی چیزوں کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے مگر خداوند تعالیٰ اپنے حکیمانہ احکام کے ذریعہ انسانوں کو فکر و عمل کے بلند تر مقام پر لے جانا چاہتا ہے۔ انسان انتہائی درجہ کا حریص اور خود غرض واقع ہوا ہے اور وہ جمع دولت ہی کو اپنے لئے ذریعۂ نجات تصور کرتا ہے۔ حالانکہ حقیقی نجات وہ ہے جو پوری سوسائٹی کی خوشحالی اور انسانی مساوات عامّہ سے حاصل ہوتی ہے اور سوسائٹی کی خوشحالی اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی۔ جب تک کہ اس کے ہر فرد میں ہمدردی و مساوات اور ایثار کا جذبہ موجود نہ ہو۔ اپنی دولت کا ایک حصہ جماعت کے لیے ماندہ افراد میں تقسیم کرنے سے کوئی انسان مفلس نہیں ہوجاتا، بلکہ اس سود ے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ایک اشارہ کیا ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ — تم جو رضا الٰہی کے حصول کے لیے زکوٰۃ دیتے ہو تو اس سے تمہارے مال میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں حکم انفاق کے بعد اشارہ ہوتا ہے

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا- وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ- (آیہ) — شیطان تمہیں فقر و احتیاج کی راہ دکھاتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت اور رزق حلال کا وعدہ کرتا ہے۔

اس آیت میں عدم انفاق کو فقر اور انفاق کو فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور نہایت لطیف پیرایۂ بیان کے ذریعہ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس نکتہ کے فہم کے لیے خداداد علم و حکمت کی ضرورت ہے اس لیے اس کے بعد متصلاً ارشاد ہوتا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا- وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (بقرہ) — خداوند تعالیٰ جسے چاہتا ہے علم و حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اسے گویا خیر کثیر ہاتھ آگئی۔ اور نصیحت تو عقلمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

متعدد احادیث و آثار میں بھی اس حقیقت باہرہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔

عن ابن عمر ان الصدقة لاتزيد المال الا كثرة (اخرجہ ابن عدی فی الکامل) — صدقہ مال میں کثرت اور برکت پیدا کرتا ہے۔

عن بريدة ما منع قوم الزكوٰة الا ابتلاهم الله بالسنين (اخرجہ الطبرانی فی الاوسط) — جس قوم نے زکوٰۃ روک لی اللہ تعالیٰ نے اس کو قحط سالی میں مبتلا کر دیا۔

زکوٰۃ ایک اجتماعی فریضہ ہے اور قرآن حکیم نے بار بار اس کی تاکید کی ہے اور جہاں نماز کا ذکر آتا ہے وہاں زکوٰۃ کے حکم کا بھی بلا فصل ذکر کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ نماز شریعت حقہ کا ایک ایسا رُکن ہے جو کفر اور اسلام میں فرق کرنے والا ہے اور قرآن حکیم کو شروع سے اخیر تک پڑھ جائیے ہر جگہ نماز اور زکوٰۃ کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اسلامی برادری کی رُکنیت و عضویت کے لیے نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی شرط قرار دیا گیا ہے۔

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (آیہ) پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں -

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق نے فتنۂ ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ اسی اصل پر مبنی تھا -

واللّٰہ لا قاتلن من فرق بین الصلٰوۃ والزکوٰۃ (بخاری)

اس کی تفصیل تو کسی دوسری جگہ آئے گی مگر یہاں صرف اتنا ہی بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے انسانی معیشت کے جو زریں اصول پیش کیے ہیں وہ انسانوں کو حریت اجتماع اور امن و مساوات کی برکات سے مالامال کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ایک طرف سرمایہ دار طبقوں کے ظالمانہ تسلط سے غریب انسانوں کو رہائی دلانے کی غرض سے سود اور اس قسم کے تمام ذرائع کا سدباب کر دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف غرباء کی امداد و اعانت اور مساوات عامہ کی نشوونما کی غرض سے زکوٰۃ اور تقسیم دولت کے دوسرے ذرائع اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج انسانی دنیا میں جس قدر اجتماعی مفاسد پائے جاتے ہیں ان کی سب سے بڑی

وجہ حب دولت اور جذبۂ سرمایہ داری ہے ۔ یہی وہ تخم خبیث ہے جس سے خود غرضی، حب النفس، جذبۂ نفرت اور انسان کشی کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور اسی ناپاک جذبۂ سرمایہ داری نے تقسیم دولت کے قدرتی اصولوں کو ناممکن العمل بنا دیا ہے اور آج دنیا کے ہر کونے میں سرمایہ دار اور مزدور میں خطرناک طبقاتی کشمکش جاری ہے ۔

بلکہ سوشلزم اور کمیونزم کے بھیانک نظریئے اسی مکروہ جذبہ کا ردعمل (ری ایکشن) ہیں ۔ اسلام انسانی دنیا کو جس معاشی نظام کی طرف دعوت دیتا ہے وہ تقسیم دولت کے قدرتی اصولوں پر مبنی ہے اور اس میں کسی قسم کی طبقاتی جنگ کا خطرہ نہیں بلکہ حکومت اسلامی کا شعبۂ مالیات ہر طبقہ کی تسکین کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل رکھتا ہے جس سے کسی انسان کو شکایت کا موقع ہی نہیں مل سکتا ۔

اسلامی نظریۂ معیشت کے عملی خصائص

یہاں تک اسلام کے اقتصادی نظام کے نظریاتی پہلوؤں پر تبصرہ کیا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ کسی نظریۂ زندگی کا محض ذہنی اور نظری طور پر کامل ہونا اس امر کے لیے کافی نہیں ہے کہ پوری انسانی دنیا کو اس کے اخذ و قبول کی دعوت دی جائے، تا وقتیکہ وہ عملی اور تجربی (پریکٹیکل) حیثیت سے انسانی سوسائٹی میں خوشگوار انقلاب پیدا کرنے اور سماج کو اپنے منشا کے مطابق چلانے کی کامل صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے اقوام حاضرہ کے اقتصادی نظریات کا جو حال ہے اس کا سرسری خاکہ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے، اور ان نظریات کا انسانی سوسائٹی میں جو ردِ عمل پیدا ہو چکا ہے وہ زمانۂ حال کے سیاسی اور اقتصادی حالات سے ظاہر ہے۔ مگر اسلام کا نظریۂ معیشت عملی اور تجربی حیثیت سے بھی ہمہ گیر افادیت کا حامل ہے۔ اور وہ کائناتِ انسانی میں بلا لحاظِ نسل و وطن مجلسی اور معاشی مساوات پیدا کرتا ہے۔

افسوس ہے کہ انسانوں کا ہر طبقہ کچھ ایسے ڈھنگ سے سوچتا ہے کہ کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت کچھ مخصوص طبقاتی اور گروہی تصورات اس کے دل و دماغ پر مسلّط ہوتے ہیں اور ترتیبِ مقدمات کے دوران میں اس کا فکر و ذہن جذباتِ عصبیت سے بُری طرح مغلوب ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ مقدمات

کو ترتیب ہی ایسے طریق سے دیتا ہے کہ نتائج بالعموم اس کے مفروضات سے مختلف نہیں ہوتے، اور اگر ہوں بھی تو تھوڑے بہت ردوبدل اور ہیر پھیر سے ان کو اپنے منشا کے مطابق ڈھال لیا جاتا ہے۔ اور اس کے باوجود اگر کوئی بیّن حقیقت اس کی نظر کے سامنے آجاتی ہے جو اس کے محبوب تصورات سے مختلف ہو تو اکثر وہ اس سے عمداً اغماض کر لیتا ہے یا اس کے مقابلہ میں تاویلات بعیدہ کا سہارا ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اگر انسان پوری آزادی اور دیانت داری کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرے تو اس کے فکر و ذہن کی آزادانہ حرکت یقیناً اسکی حق و صداقت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ عقلیت محضہ جو علوم نبوت سے بالکل تہی دست ہے اسے صداقت کی ہر آواز سے بے بہرہ رکھتی ہے اور یہی چیز سینکڑوں مصیبتوں کی ایک مصیبت ہے جو انسان کو ہلاکت و بربادی کے ناپیدا کنار سمندر کی طرف لے جا رہی ہے۔

وبالعقل تنزدحم الھموم علی الحشاء   فالعقل عندی ان تزول عقول

اسلامی نظریۂ معیشت کی عظمت و برتری کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کی دماغی کاوشوں کا مرہون منت نہیں بلکہ اُس خالق کائنات کا بھیجا ہوا ہے جس کی نظر میں دنیا کے سب انسان برابر ہیں اور پھر نظری اور استدلالی حیثیت سے بھی ہر دانشمند انسان کو یہ ماننا پڑیگا کہ اسی اقتصادی نظریہ سے کائنات انسانی فقر و فاقہ کے جانکاہ مصائب اور غربت و افلاس کے چنگل سے رہائی پا سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے تمام تر اصول

ونظریات ہر قسم کے تعصب اور تفریق و امتیاز سے بلند تر اور وسیع تر ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر تاریخی اور واقعاتی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی نظریۂ معیشت دوست و دشمن سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

علم المعیشت کے موجودہ نظریوں کی شرمناک ناکامی

آج علم المعیشت (اکنامکس) نے محض علمی حیثیت سے بہت کچھ ترقی کی ہے، یعنی انسانی زندگی کے اس شعبہ پر بڑی بڑی مجلدات مرتب ہو چکی ہیں اور بے شمار ایسی انقلابی اصطلاحات ایجاد ہو چکی ہیں جن کی جمع و ترتیب کے لیے ایک مستقل ڈکشنری کی ضرورت ہے۔ بڑے بڑے ماہرین اقتصادیات نے نئے نئے اقتصادی اصول ونظریات اختراع کیے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہی مسئلہ آج مفکرین عالم کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مگر یہ بات ہمارے لیے وجہ حیرت بنی ہوئی ہے کہ جس قدر انسان کے اقتصادی مسئلہ کو حل کرنے کی جد و جہد تیز ہوتی جا رہی ہے اس سے بہت زیادہ انسانی معیشت کی پیچیدگیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور ازمنۂ سابقہ میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی ضرورت اس قدر شدت کے ساتھ کبھی محسوس نہیں ہوئی جو آج محسوس کی جا رہی ہے، اور شاید یہ روز افزوں علمی کاوشیں ہی نسل انسانی کی ہمہ گیر تباہی پر منتج ہوں۔

یہ تو آگے کسی موقع پر عرض کیا جائے گا کہ انسانی معاشیات کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں جتنا کہ آج پیچیدہ بنا لیا گیا ہے۔ مگر اسلامی نظریۂ معیشت اپنی انتہائی

سادگی کے باوجود معیشتِ انسانی کی الجھنوں کو احسن طریق سے حل کر سکتا ہے۔
یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اقوامِ حاضرہ کے معاشی نظریات اور معاشیاتِ انسانی کی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں ان کی لگاتار کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ اس کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہوں۔ لیکن میرے نزدیک اس کے دو بڑے اسباب یہ ہیں:

(۱) اس سے قبل یہ لکھا جا چکا ہے کہ دورِ حاضرہ کے عصبیاتی اور طبقاتی تصورات نے انسانی دنیا کو سینکڑوں متضاد اور متغائر گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جغرافی قومیت، رنگ و نسل کا امتیاز اور افکار و عقائد کا شدید تعصب ہی وہ فتنے ہیں جن سے زندگی کا کوئی شعبہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ ہم آگے چل کر بالتفصیل عرض کریں گے کہ اسلام میں جس طرح قومی، نسلی اور لسانی عصبیت کے لیے کوئی جگہ نہیں، اسی طرح وہ انسانوں کے بنیادی حقوق (فنڈ مینٹل رائٹس) میں افکار و عقائد کے تعصب کو بھی برداشت نہیں کرتا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے، کہ عہدِ حاضر کے اربابِ فکر و نظر نے انسانی زندگی کے مختلف اجزا کو اس طرح الگ الگ کر دیا ہے کہ گویا ان میں کوئی تعلق وارتباط نہیں۔ حالانکہ حیاتِ انسانی کے عناصر باہم اس طرح پیوست، مربوط اور مرتب ہیں کہ ان میں نہ تقدیم و تاخیر کی گنجائش ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک عنصر یا چند عناصر کو زندگی کے مجموعہ سے نکال دیا جائے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں پوری زندگی فساد و اختلال کی نذر ہو کر رہ

جاتی ہے۔

۷ عصر حاضر کے اقتصادیین کا فیصلہ یہ ہے کہ موجودہ خلفشار کا تنہا ایک سبب ہے اور وہ یہ کہ دولت کی تقسیم غیر منصفانہ ہے، اب یہ لوگ تمام انسانی مسائل سے توجہ ہٹا کر صرف معاشی مسئلہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ پوری انسانی زندگی صرف اسی ایک نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے ۔ اور جب اس مسئلہ کو حل کر لیا جائے گا تو دوسرے تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے مگر اس بات سے بالکل اغماض کر لیا جاتا ہے کہ مسئلہ معیشت کا انسانی زندگی کے دیگر اجزا سے کیا تعلق ہے اور حیاتِ انسانی کے مجموعہ میں اسے کس جگہ رکھا جانا چاہیئے؟ نیز دیگر اجزاء حیات جو اس سے مقدم یا موخر ہیں ان کو اس مسئلہ میں کس طرح کا اور کتنا دخل ہے؟ مگر یہ لوگ تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ انسان میں معدہ ہی ایک ایسا عضو رئیس ہے کہ اس کا خلا بھر جانے سے زندگی کا اصل مقصد پورا ہو جاتا ہے اور کائنات ناسوتی اور عالم لاہوتی کے تمام رازہائے سربستہ اس کی پُراسرار قوت سے خود بخود افشا ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ سب سے بڑی غوایت ہے جو ہر زمانہ میں اپنا کام کرتی رہی ہے اور آج اس نے باقاعدہ اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

اگر دقّت نظر سے دیکھا جائے تو انسانی مصائب کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسانی عقل زندگی کی ماہیت معلوم کرنے میں ناکام رہی ہے اور اس کی جولانیاں محض سطحی اجزاء حیات ہی تک رُک کر رہ گئی ہیں۔ چنانچہ کسی ایک ہی جزو کو مقصود بالذات بنا لیا گیا اور دیگر تمام اجزاء کو کلّی طور پر

نظر انداز کر دیا اور اگر کچھ زیادہ رواداری سے کام لیا تو دیگر تمام حیاتیاتی اجزاء کو اس ایک جزو کے تابع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب تک عناصر زندگی میں سے ہر عنصر کا طبعی اور فطری اقتضا تکمیل پذیر نہ ہو زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی اختلال و فساد سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور پوری زندگی میں بے ربطی اور بے نظمی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ حیاتِ انسانی صرف اسی صورت میں انتشار اور بد نظمی کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے کہ اس کے ہر جزو کو اس کی اصل جگہ پر رکھا جائے۔ اور اس کو اتنی ہی اہمیت دی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔

رنگ و نسل اور مسلک کے اختلاف کا اثر معاشیاتِ انسانی پر

اس میں شک نہیں کہ حریت و مساوات اور جمہوریت کے خوش کن الفاظ آج کرۂ ارض کے کونے کونے میں گونج رہے ہیں اور شاید ہی کوئی بدنصیب انسان ہوگا جو اب تک ان الفاظ سے نا آشنا ہوگا۔ سب سے پہلے فرانس کے ارباب حریت و انقلاب نے اپنے منشورِ آزادی کے ذریعہ حقوقِ انسانی کا اعلان کیا اور تمام دولِ مغرب میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ اس منشور میں حریتِ انسانی اور مساواتِ حقوق کے فطری داعیات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا اور اس کے نتیجہ کے طور پر دوسرے ممالک کے عوامی طبقے بھی اس انقلابی جد و جہد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ امریکہ اور اس کے بعد روس میں بھی اسی قسم کی انقلابی تحریکیں اٹھیں اور بالآخر یہ تحریکیں بھی فرانس

کی تحریکِ حریت کی طرح بار آور ثابت ہوئیں۔ چنانچہ آج دنیا کے سماجی اور سیاسی نظاموں میں روس اور امریکہ کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مگر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان ممالک میں بھی انسانی آبادی انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم ہے۔ اور حریت و مساوات کے اعلانات کبھی شرمندہ معنی نہیں ہو سکے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ (یونائیٹڈ سٹیٹس) میں ایک سے زائد قومیں آباد ہیں۔ جن میں شدید نسلی تعصب پایا جاتا ہے۔ جہاں تک سٹیٹ کے دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) کا تعلق ہے اس میں سفید فام اور سیاہ فام اقوام کے مساوی حقوق تسلیم کیے گئے ہیں، اور اس کی رُو سے ملک کا ہر باشندہ ہر قسم کے سیاسی، عمرانی اور معاشی حقوق میں برابر کا حصہ دار ہے مگر عملاً ان حقوق سے صرف گوری نسل کے لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان میں بھی اعلیٰ سیاسی حقوق سے وہی لوگ متمتع ہو رہے ہیں جو ۱۸۴۹ء کے انقلاب سے پہلے امریکہ میں آباد ہوئے تھے اور جو لوگ اس کے بعد آئے ہیں وہ شہری اور سماجی حقوق میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس ملک میں ایک سیاہ فام حبشی قوم بھی آباد ہے جو ملک کی مجموعی آبادی میں نو فی صدی سے کچھ زائد ہے۔ اور یہ بدقسمت قوم ہر قسم کے سماجی اور شہری حقوق سے بے بہرہ ہے بلکہ اسے انسانیت کے ابتدائی حقوق سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ بالخصوص جنوبی ریاستوں میں ان لوگوں کو سرے سے حقِ رائے دہندگی ہی حاصل نہیں اور کچھ دوسری ریاستوں میں محض برائے نام یعنی فی ہزار آبادی میں صرف ایک فرد کو ووٹ دینے کا حق ہے اس کے علاوہ

سماجی طور پر ان کی حالت وہی ہے جو ہندوستان کے اچھوتوں کی ہے۔ عبادت گاہوں میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ سینماؤں، ہوٹلوں، ریسٹورنٹوں اور دیگر پبلک مقامات میں ان کو جانے کی اجازت نہیں ہے اور ان کے بچے ان سکولوں میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتے جہاں سفید فام لوگوں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔

اس نسلی تعصّب کا نتیجہ ہے کہ یہ حبشی النسل آبادی اقتصادی طور پر نہایت مفلوک الحال ہے۔ ان کا ذریعۂ معاش زیادہ تر کاشتکاری ہے۔ مگر ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو صرف حصّہ داری کے طور پر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں اور وہ زمین کے مالک نہیں، ان کسانوں کو زمینداروں کے ساتھ جکڑے رکھنے کے لیے سخت گیرانہ قوانین بنائے گئے ہیں اور ان کی حیثیت قیدیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ چند سالوں سے یہ لوگ ملکی صنعتوں میں بھی کام کرنے لگے ہیں مگر حکومت ان سے سفید فام لوگوں کی نسبت بہت مشکل کام لیتی ہے اور ساتھ ہی ان کو معاوضہ بھی بہت کم ملتا ہے۔

تعصّب کی اس سے زیادہ واضح مثال کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی حبشی، سفید فام لوگوں کی آبادی میں یا اس سے قریب کسی قسم کی جائداد نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ گوری نسل کے لوگ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ حبشی کسی بات میں ان کی برابری کریں۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۱ء تک کے درمیانی عرصہ میں قریباً ۵۸ مکانات کو جو حبشیوں نے خریدے تھے بموں سے اڑایا گیا، ایک حبشی بینکر کے مکان اور دفتر پر کئی بم پھینکے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بینک سے حبشیوں کو نسبتاً بہتر شرائط پر قرض مل سکتا تھا اور اس سے حبشی لوگ

جائدادیں خریدنے اُٹھ گئے تھے۔

غرض جمہوریت و مساوات کے یہ علمبردار اپنے ملک کی ایک کروڑ تیس لاکھ آبادی سے جو ظالمانہ سلوک کر رہے ہیں کسی وحشی ملک میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس ملک کے سفید فام لوگ انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ کہ یہ بدقسمت قوم معاشی حیثیت سے ان کے پیچھے دبی رہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہی لوگ معاہدہ اطلانٹک (اٹلانٹک چارٹر) کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے زیادہ شور مچاتے ہیں اور دوسروں کو حریت و آزادی کا سبق دیتے ہیں۔ مگر ان کے اپنے گھر کی حالت یہ ہے کہ ملک کی ایک بڑی آبادی کو کتوں سے بدتر تصوّر کیا جاتا ہے۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت، پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

سوویٹ روس کا نظام اجتماع و سیاست چند معاشی نظریوں پر مبنی ہے اور ان معاشی نظریوں کا اقتضا یہ ہے کہ تقسیم دولت کے ناجائز طریقوں کو مٹا کر انسانوں میں معاشی مساوات پیدا کی جائے۔ مگر یہاں نسلی تعصّب کی جگہ اعتقادی اور نظریاتی تعصب نے لے لی ہے۔ چنانچہ پرستاران اشتراکیت کا بنیادی عقیدہ ہے کہ قوت و اقتدار کے ذریعہ اپنے اصولوں کو دنیا سے منوایا جائے اور جو لوگ ان اصولوں کو تسلیم نہ کریں ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے یعنی اشتراکیت (کمیونزم) اپنے مخالفین کو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دینا چاہتی چہ جائیکہ وہ ان کو مساویانہ حقوق دلائے۔

یہ تو ان ممالک کا حال ہے جو آج حریت و مساوات کے دیوتا خیال

کیے جاتے ہیں۔ مگر دوسرے نیم جمہوری اور بالخصوص وہ ممالک جہاں آج تک کسی نہ کسی شکل میں ملوکیت و استبداد کی لعنت موجود ہے کی حالت کیا ہو گی اس کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ جنوبی افریقہ کی مثال اس کے لیے کافی ہو گی کہ وہاں کے نسلی قوانین نے سیاہ فام اقوام کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ نیٹال کی انڈین کانگریس اور ہندوستان کے متفقہ احتجاج کے باوجود ان ظالمانہ قوانین کی کڑیاں پہلے سے بھی سخت ہو رہی ہیں۔

اسلام کا نظام اجتماع و تمدن ہر طرح کی نسلی، لسانی اور جغرافی عصبیت اور تفریق و امتیاز اور انسانی حقوق کی حفاظت و نگرانی میں ہر قسم کے مذہبی اور اعتقادی تعصب سے بالاتر ہے۔ جہاں تک اوّل الذکر یعنی نسلی اور جغرافی امتیاز کا تعلق ہے اسلام کا کوئی بدترین دشمن بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمان کا دامن اس قسم کے تعصب سے ملوث نہیں ہوتا اور اسلام اسے ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرتا۔ البتہ جو لوگ اسلام کے نظام اجتماع و تمدن سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اور خلافت راشدہ کے مقدس دور کی درخشندہ روایات ان کی نظر سے نہیں گذریں وہ مسلمانوں پر مذہبی اور اعتقادی تعصب کا الزام لگاتے ہیں مگر آئندہ سطور میں ہم کتاب و سنت اور مستند تاریخی شواہد کے ذریعہ ثابت کریں گے کہ جس حد تک انسانیت کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے، اسلام میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں یعنی مساواتِ عامہ اور حریت اجتماع کے لحاظ سے ملک کے تمام باشندے مساوی الدرجہ ہیں۔

اسلام میں حریتِ انسانی کا اعلانِ عام

اسلام نے ہر قسم کے اختلاف و امتیاز سے قطع نظر ہر اُس انسان کے تمدنی، عمرانی، تہذیبی اور معاشی حقوق کے احترام و تحفظ کا ذمہ لیا ہے جو مملکتِ اسلامی میں رعایا کے طور پر آباد ہو، خواہ وہ حبشی النسل ہے یا رومی، عربی النسل ہے یا عجمی، یہودی و نصرانی ہے یا ایران و ہند کا بُت پرست، مسلمان ہے یا غیر مسلم، بنیادی حقوقِ انسانیت کے اعتبار سے سب مساوی ہیں، اسلام کے تعزیری اور معاشی قوانین کا سب پر یکساں نفاذ ہوتا ہے یہاں تک کہ عقیدہ و مسلک کا اختلاف بھی شہری اور معاشی مساوات عامہ پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ چنانچہ کتاب و سنت، قانون فقہی اور تاریخ اسلامی کے مستند حقائق کی روشنی میں بہانگ دہل اعلان کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں تمام انسان نفسِ انسانیت کے اعتبار سے برابر ہیں۔ نسلی اور قومی وجاہت، قبیلوی شرافت اور وطنی عصبیت کی قسم کے جاہلی تصورات کو اجتماعِ اسلامی (اسلامک سوسائٹی) میں کسی قسم کا دخل نہیں اور کوئی انسان ان امتیازات کی وجہ سے کسی امتیازی سلوک کا حق دار نہیں۔ ہاں خدائے قدوس کی محبوبیت صرف اسی کو حاصل ہے جو اخلاق و سیرت اور کردار کے لحاظ سے ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (آیہ)	اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر کئی شعوب و قبائل میں تقسیم کیا صرف اس لیے کہ تم ایک دوسرے سے

پہچانے جاسکو۔ مگر تم میں معزز اور بزرگ تر وہ شخص ہے جو سب سے
زیادہ خداترس اور باعمل ہے۔

شعوب، شعب کی جمع ہے اور اس سے مراد سلسلۂ نسب
کی ابتدائی کڑی ہے جو بعد میں آنیوالی کڑیوں کے لیے مبدا کی حیثیت
رکھتی ہے اور ان بعد میں آنے والی کڑیوں کو "قبائل" سے تعبیر کیا گیا
ہے اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ سلسلۂ نسب ابتدا سے انتہا تک
نفس انسانیت پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوسکتا اور ہر انسان بہر حال
محض انسان ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کا ہم پلہ ہے۔

الناس بنو آدم و آدم من تراب — سب لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور
(مشکوٰۃ) — آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے۔

اس حدیث کا منشا بالکل ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کا
مائۂ خمیر ایک ہی ہے اور اصل سرشت کے لحاظ سے کوئی انسان
دوسرے سے بہتر نہیں۔ اس بنا پر ان کے حقوق میں بھی کسی قسم
کی تفریق نہیں ہونی چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ سردار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے
کہ وہ انسانوں کے حقوق کی نگہداشت کریں اور کسی انسان سے کسی قسم کا ظالمانہ سلوک نہ کریں

ان اللہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا (اخرجہ ابو داؤد) — جو لوگ انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اللہ تعالےٰ ان کو عذاب دے گا۔

عن عمر قال سمعت رسول اللہ صلعم — لوگوں پر تشدد نہ کرو کیونکہ جو لوگ دنیا میں

يقول لا تعذبوا الناس فان الذين | انسانوں پر ظلم کرتے ہیں خدا ان کو قیامت
يعذبون الناس يعذبهم الله يوم القيامة | میں عذاب دے گا۔

(اخرجه ابو یوسف فی کتاب الخراج)۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ امراء و عمال کے سامنے تقریر فرمائی اور ان کو ذیل کے الفاظ میں حقوق انسانی کے تحفظ کی تاکید کی

الا وانی لم ابعثکم امراء ولا جبارین | میں نے تم کو امیر اور جابر حکمران بنا کر نہیں بھیجا
ولکن بعثتکم ائمة الهدیٰ یهتدیٰ | بلکہ ائمہ ہدایت بنا کر بھیجا ہے کہ تم سے لوگ
بکم ولا تغلقوا الابواب دونهم فیاکل | ہدایت حاصل کریں اور رعایا پر اپنے دروازے
قویهم ضعیفهم (کتاب الخراج) | بند مت کرو کہ طاقتور کمزور کو کھا جائے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام میں بغیر کسی تفریق و امتیاز کے تمام افراد رعیت کے حقوق کی نگہداشت کرنا از حد ضروری ہے اور یہ کہ حکومت اسلامی میں مذہب وملت اور عقیدہ وخیال کا اختلاف حقوق انسانیت کی تکمیل میں حارج نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں سے مساویانہ سلوک کرنا لازمی ہے۔

ذمی رعایا کے معاشی حقوق

حکومت اسلامی میں غیر مسلم رعایا سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے، اور یہ جزیہ نہایت معمولی درجہ کا حکومتی ٹیکس ہے، یعنی اعلیٰ درجہ کے امراء سے ۱۲ روپے متوسط الحال لوگوں سے ۶ روپے اور عام پیشہ ور لوگوں سے ۳ روپے سالانہ لیا جاتا ہے۔ یہ اتنی حقیر رقم ہے کہ معمولی سے معمولی شخص بھی اسے بآسانی ادا کر سکتا ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں ہر سال مسلمانوں کو اپنی دولت کا ۲½ فیصدی

حصّہ حکومت کو دینا پڑتا ہے۔ اگر ایک کروڑ پتی مسلمان ہے تو اس سے سال میں ۲½ لاکھ روپیہ وصول کیا جاتا ہے، اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے علاوہ عشر اور دیگر صدقات بھی مسلمانوں کو دینے پڑتے ہیں۔ اور اہل الذّمہ کی جان و مال کی حفاظت کرنا اور ہر قسم کی فوجی خدمات انجام دینا مسلمانوں کے ذمّے ہے۔

اہل الذّمہ صرف معمولی ٹیکس حکومت کو دے کر ہر طرح سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور ان کو فوجی خدمات سے مستثنٰے کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نصارئ نجران سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں ان کے بنیادی حقوق کی ان الفاظ میں وضاحت فرما دی ہے:

علی اموالھم وانفسھم وارضھم وملتھم وغائبھم وشاھدھم وعشیرتھم و بیعھم و کل ماتحت ایدیھم من قلیل اوکثیر (کتاب الخراج)	ان کے مال، جان، زمین، مذہب، غائب، حاضر، قبیلہ، عبادتگاہوں اور ہر اُس چیز پر جو ان کے قبضہ میں ہے یہ معاہدہ حاوی ہوگا۔

اس کے علاوہ ذمّی رعایا کے مفلوک الحال اور معذور لوگوں کی کفالت بھی حکومت کے ذمّے ہوتی ہے۔ چنانچہ عہدِ ابوبکرؓ میں خالد بن الولید نے حیرہ کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی:

ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابہ آفۃ من الآفات او کان غنیاً فافتقر وصار اھل دینہ یتصدقون علیہ	جو بوڑھا شخص کام کرنے سے عاجز ہو جائے یا اس کا جسم کسی آفت سے ماؤف ہو جائے یا کوئی مالدار شخص اس قدر غریب ہو جائے

طرحت جزیۃ و عیل من بیت مال المسلمین و عیالہ (کتاب الخراج) | کہ اس کے ہم مذہب اس کو صدقہ دینے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اس کی اور اس کے عیال کی کفالت بیت المال کے ذمہ ہوگی

ذمیوں کی جان کی حفاظت

مساوات عامہ کی اس سے زیادہ درخشندہ مثال کیا ہو سکتی ہے کہ اسلامی حکومت میں مسلمانوں اور ذمی رعایا کی جان و مال میں کوئی فرق نہیں، جس طرح مسلمان کی جان و مال کی حفاظت کرنا حکومتِ اسلام کا فرض ہے اسی طرح غیر مسلم ذمی کی جان و مال بھی حکومتِ اسلامی کے تحت محفوظ ہوتی ہے یہاں تک کہ ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر قرار دی گئی ہے یعنی اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو شرعی قانون کے مطابق اس مسلمان سے قصاص یا دیت لینا ضروری ہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں اس پر عمل رہا۔

ان ابابکر و عمر کانا یجعلان دیۃ الیھودی والنصرانی اذا کانا معاھدین دیۃ الحر المسلم۔ | حضرت ابوبکر اور حضرت عمر یہودی اور نصرانی اہل الذمہ کی دیت آزاد مسلمان کے برابر قرار دیتے تھے۔

عن علی من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا ودیتہ کدیتنا (اخرجھا الدار قطنی)۔ | جو شخص ہمارے عہد میں آجائے اس کا خون ہمارے خون اور اس کی دیت ہماری دیت کے برابر ہے۔

چنانچہ حضرت عمر کے زمانہ میں ایک مسلمان نے یہودی کو قتل کر دیا جب

حضرت عمر کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کو ایک بڑا سانحہ قرار دیا اور فرمایا میرے دورِ خلافت میں انسانوں کا خون ہو؟ میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ جسے قاتل کا علم ہو وہ مجھے بتائے۔ حضرت بکر ابن شداخ نے کہا، امیرالمومنین، اس کا قاتل میں ہوں۔ فرمایا! تو پھر تم سے قصاص لیا جائے گا یا اپنی برأت ثابت کرو۔

حضرت علی کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ذمّی کو قتل کر دیا۔ یہ معاملہ حضرت علی کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے قصاص کا حکم دیا، لیکن مقتول کے ورثاء نے قاتل کو معاف کر دیا، اس پر حضرت علی نے فرمایا، تمھیں کسی نے دھمکی تو نہیں دی؟ جواب دیا، ہم نے اسے اس لیے معاف کر دیا ہے کہ اسے قتل کرنے سے ہمارا بھائی زندہ نہیں ہوسکتا اور قاتل نے اس کا معاوضہ ہمیں دے دیا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہدِ خلافت میں حیرہ کے ایک مسلمان نے ذمّی کو قتل کر دیا۔ امیرالمومنین نے وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے وہ چاہیں تو اسے قتل کریں یا معاف کر دیں۔ چنانچہ قاتل کو ان کے حوالے کر دیا گیا اور انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

کتب فقہ میں ذمّی رعایا کے حقوق کے سلسلہ میں یہ واضح اور جامع قانون موجود ہے۔

فان بذلوھا فلھم ما للمسلمین و علیھم ما علی المسلمین	اگر وہ جزیہ دینا قبول کر لیں تو وہ ہر طرح کے نفع و نقصان میں مسلمانوں کے برابر ہیں۔
(ہدایہ کتاب السیر)	

ذمّیوں کے مال و جائداد کی حفاظت اور ان کے لیے کاروبار کی آزادی

جہاں تک ذمیوں کے اموال کی حفاظت کا تعلق ہے زمانۂ رسالت اور خلافت راشدہ کے ان معاہدات سے ظاہر ہے جو غیر مسلم مفتوح اقوام سے کیے گئے۔ مگر یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ یہ معاہدات موجودہ اقوام کے معاہدوں کی طرح نہ تھے کہ ان کو کاغذ کے معمولی پُرزے سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا ہو چنانچہ اقوام حاضرہ کے معاہدات کی نسبت سولن نے خوب کہا ہے، کہ یہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور چیز کو پھنسا لیتا ہے اور طاقتور کے مقابلہ میں پاش پاش ہو جاتا ہے، بلکہ مسلمانوں نے ان معاہدات کے ایک ایک لفظ پر نہایت سختی کے ساتھ عمل کیا اور اس کے لیے تاریخ اسلامی کے اوراق گواہ ہیں۔

اسلام میں معاہدہ کی پابندی ایک اہم ترین فرض ہے۔ یہاں تک کہ قرآنِ حکیم نے غیر مسلم معاہد قوم کے مقابلہ میں مسلمانوں کی امداد و حمایت سے بھی منع کر دیا ہے۔

إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ (انفال)

حضرت عمرؓ ذمیوں سے کیے گئے معاہدات کی پابندی کے لیے حکام و وُلاۃ کو بار بار تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ فتح شام کے بعد انھوں نے حضرت ابوعبیدہ کو تحریر فرمایا:

وامنع المسلمین من ظلمهم والاضرار بهم — آپ مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو

واکلھم اموالھم واوف لھم بشرطھم الذی شرطت لھم فی جمیع ما اعطیتھم (کتاب الخراج)	نقصان پہنچانے اور ان کا مال غصب کرنے سے روکیں اور معاہدہ میں جو حقوق آپ نے تسلیم کیے ہیں ان کو پورا کریں۔

نیز حضرت عمرؓ نے آخری وقت اپنے جانشین کو خاص طور پر یہ وصیت کی:

اوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ان یوفی لھم بعھدھم (بخاری)	میں اس کو اللہ اور اس کے رسول کے عہد کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ ذمیّوں کے حقوق کا پورا خیال رکھے۔

اس کا یہ نتیجہ تھا کہ کوئی مسلمان ذمیّوں کی کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ حکومتی ٹیکس کے سوا کسی مسلمان کو اجازت نہ تھی کہ ان کو کسی قسم کا مالی نقصان پہنچائے یا ان کی کسی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کرے بلکہ ممالک مفتوحہ کی زمینیں جوں کی توں اصل مالکوں ہی کے قبضہ میں رہنے دی جاتی تھیں۔ اور حضرت عمرؓ نے تو اس میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے ان کی زمینیں خریدنا بھی ممنوع قرار دے دیا۔ کیونکہ اس کی اجازت دی جاتی تو تمام زمینیں اہل عرب کے قبضہ میں آجاتیں اور ذمّی رعایا کسب معاش سے بالکل محروم ہو جاتی اور پھر کوئی مسلمان ان کے اموال پر دست درازی کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسلمان نے کسی سرکاری کام کے لیے ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے چالیس کوڑے لگوائے۔

دولتِ بنی امیہ کے جابر حکمرانوں نے ذمیوں کی کچھ زمینیں غصب کر لی

تھیں اور ان کو شاہی خاندان میں جاگیر کے طور پر تقسیم کیا تھا۔ عمر ثانی نے ایسی تمام زمینیں ذمیوں کو واپس دلائیں۔ چنانچہ ایک ذمی نے عباس ابن الولید کے خلاف دعویٰ دائر کیا کہ اس نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ حضرت عمر ثانی نے عباس سے کہا تم اس کا کیا جواب دیتے ہو۔ عباس نے کہا یہ زمین مجھے ولید نے جاگیر کے طور پر دی ہے اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے۔ آپ نے فرمایا خدا کی کتاب ولید کی سند سے مقدم ہے اور ذمی کو زمین واپس دلا دی۔

غرض ذمیوں سے کیے گئے معاہدات کے ایک ایک لفظ کا جس طرح مسلمانوں نے احترام کیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ ذمی رعایا کو تجارت، زراعت اور ہر طرح کے کاروبار کی مکمل آزادی حاصل تھی بلکہ ان کو اس سلسلہ میں خاص رعایتیں دی جاتی تھیں تاکہ ملک میں اشیاء تجارت کی نقل و حرکت وسیع پیمانہ پر جاری رہے۔ اور عامتہ الناس کو کسی چیز کے حصول میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس مقصد کے لیے شام کے غیر مسلم تاجروں کا محصولِ تجارت بقدر نصف کم کر دیا تھا۔

خلافتِ اسلامی اور مساواتِ عامّہ

موجودہ قومیں زبانی طور پر جس قدر حریّت و مساوات کا شور مچاتی ہیں اس سے زیادہ وہ مساوات کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اور نہایت افسوس سے اس رنج وہ حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے، کہ یہ لوگ

لفظوں کے گورکھ دھندے سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ
دعوائے آزادی و مساوات کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ کاش! اگر اسلامی روح
مساوات کی ایک ہلکی سی جھلک ہی ان میں موجود ہوتی تو آج عالمِ انسانی
نغمہ ہائے مسرت سے گونج رہا ہوتا۔

افرادِ رعیت میں بلا لحاظ مذہب و نسل عملی مساوات پیدا کرنا اسلام کا
وہ عظیم الشّان کارنامہ ہے جس پر نسلِ انسانی ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ مگر اس
سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسلام میں خلفا و امرا کے سماجی اور
معاشی حقوق عام افرادِ رعیت کے برابر ہیں اور وہ کسی بات میں دوسروں سے
اعلیٰ و برتر نہیں ہیں۔ موجودہ بادشاہوں اور پریسیڈنٹوں کی طرح وہ ملکی خزانہ سے
کروڑوں کی تنخواہیں نہیں لے سکتے اور نہ اپنے لیے عظیم الشان محل بنوا سکتے ہیں
ان کے لیے فاخرہ لباس کی قطعاً ضرورت نہیں، اور نہ ہی لعل و جواہر سے لدے
ہوئے تخت و تاج کی ان کو ہوس ہے۔ بلکہ وہ قلندرانہ شان کے ساتھ حکومت
کرتے ہیں ؎

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند　　در شہنشاہی فقیری کردہ اند!

اسلامی خلیفہ جاہ پسندی، خود غرضی، علو فی الارض اور عیش کوشی کی
کمینہ خواہشات سے بہت دور اور نائب حق کی حیثیت سے حقائق کائنات
کا شارح اور اسرار حیات کا مفسّر ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی زندگی عالم انسانی کے
لیے نمونۂ عمل ہوتی ہے ؎

نائب حق ہم چو جانِ عالم است　　ہستیٔ او ظل اسم اعظم است

از رموز جزو کل آگاہ بود — در جہاں قائم بامراللہ بود
نوع انساں را بشیر وہم نذیر — ہم سپاہی، ہم سپہ گر ہم امیر
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است — از جلالِ او نجاتِ عالم است
زندگی را مے کند تفسیر نو — می دہد ایں خواب را تعبیر نو (اقبال)

زمانہ رسالت میں جب حکّام و عمّال کا تقرّر ہوا تو خود آنحضرت صلعم نے ان کی ضروریاتِ زندگی اور معاوضہ عمل کا واضح الفاظ میں تعیّن فرما دیا۔

من کان لنا عاملاً فالیکتسب زوجۃً	جو ہمارا عامل مقرّر ہو تو اسے شادی کر لینا
فان لم یکن لہ خادم فالیکتسب خادماً	چاہیئے۔ اور اگر اس کے پاس ملازم نہ ہو تو ملازم
وان لم یکن لہ مسکن فالیکتسب مسکناً	رکھ لینا چاہیئے اور اگر مکان نہ ہو تو مکان
ومن اتخذ غیر ذالک فھو غالٍ او	بنا لینا چاہیئے ۔ لیکن اگر کوئی اس سے
سارق (ابوداؤد)	زیادہ لے گا تو وہ خائن یا چور ہوگا۔

زمانۂ خلافت راشدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصریحات معیار عمل کا کام دیتی رہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق منتخب ہونے سے پہلے کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ جب ان کو مسلمانوں نے خلیفہ منتخب کر لیا تو بدستور سابق کپڑوں کی گٹھڑی لے کر بازار کا رُخ کیا۔ اتفاقاً حضرت عمر راستہ میں مل گئے۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہا کہ اگر تم یہ کام کروگے تو امورِ خلافت کا انتظام و انصرام کون کرے گا۔ چلیئے ہم آپ کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرّر کریں گے جب وظیفہ مقرر ہو گیا تو خلیفۂ اوّل نے یہ اعلان فرمایا:

فسیاکل آل ابی بکر من ھذا المال — اب آل ابوبکر بیت المال سے نان و نفقہ

ویحترف للمسلمین (بخاری کتاب البیوع)   لے گی اور مسلمانوں کے لیے کام کرے گی۔

مگر یہ وظیفہ قوت لایموت سے زیادہ نہ تھا۔ اور انھوں نے اپنی ضروریات کو اس قدر محدود کر دیا تھا کہ نہایت حقیر رقم میں وہ گزر اوقات کرتے تھے۔ بعض دفعہ کئی دنوں تک گھر میں فاقہ رہتا۔ مگر آپ کے تقوے کا یہ عالم تھا کہ معیّن وظیفہ کے علاوہ ایک حبّہ تک بیت المال سے لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اور وفات کے وقت وظیفہ کی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ اب میں مسلمانوں کا امیر نہیں ہوں۔

یہ سب کچھ اس تاجدار مدینہ صلوات اللہ علیہ کے اثر صحبت کا نتیجہ تھا جو مسجد نبوی میں لعل و جواہر کے ڈھیر اپنے ہاتھوں تقسیم فرماتے۔ اور خود خالی ہاتھ گھر کو تشریف لے جاتے تھے اور کئی کئی دنوں تک آپ کے گھر میں آگ تک نہ سلگتی تھی ؎

بلند مرتبہ زاں خاک آستاں شدہ ام
غبار کوئے توام گر بہ آسماں شدہ ام

حضرت فاروق اعظم کی عظمت و شوکت اور شان جبروت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے شہنشاہ آپ کی قدم بوسی حاصل کرنا فخر سمجھتے تھے۔ مگر ان کی زندگی کا معیار کیا تھا۔ یہ خود ان کی زبانی سنئے :

انی انزلت نفسی من مال اللہ بمنزلۃ والی الیتیم ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت بالمعروف۔ (اخرجہ البیہقی)   خدائی مال میں، میں نے اپنے آپ کو والیٔ یتیم کی حیثیت دے رکھی ہے کہ حالت فراغ میں اس مال سے پرہیز کروں اور حالت عسر میں صرف بقدر ضرورت کھاؤں۔

اسد الغابہ میں حضرت عمرؓ کی نسبت ذیل کے الفاظ درج ہیں :

ونزل نفسه بمنزلة الاجير وكاحاد المسلمين (اسد الغابہ جلد ۴)

وہ بیت المال سے صرف اتنا لیتے جتنا کہ ایک مزدور اور عام مسلمان لے سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خطبہ ارشاد فرمایا، جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں :

عن السائب ابن يزيد قال سمعت عمر ابن الخطاب يقول والله الذى لا اله الا هو ما احد الا وله فى هذا المال حق اعطيه او منعه وما احد احق به من احد الا عبد مملوك وما انا فيه الا كاحدكم

اُس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اس مال میں ہر ایک کا حق ہے خواہ اسے اس کا یہ حق دیا جائے یا نہ دیا جائے اور عبد مملوک کے سوا کوئی اس مال میں زیادہ حق دار نہیں اور میں اس مال میں تم میں کا ایک فرد ہوں۔

"ما انا فیہ الا کاحدکم" کا فقرہ جس عدیم النظیر مساواتِ عامّہ کا تصوّر پیش کر رہا ہے وہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت ہے۔ دنیا کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اسی خطبہ میں آگے چل کر ارشاد ہوا ہے :

والله لئن بقيت لياتين الراعى بجبل صفاء حظه من المال وهو مكانه قبل ان يحمر وجهه يعنى فى طلبه۔ (کتاب الخراج)

خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو جبل صفاء کے رہنے والے کو اس کی جگہ پر ہی اس کا حصہ پہنچ جائے گا اور اسے آنے کی مشقت نہ اٹھانی پڑے گی۔

ایک دفعہ آپ نے اپنے اخراجات کی یوں تفصیل فرمائی :

اخبركم بما يستحل لى منه حلتان

میں آپ کو بتاؤں کہ بیت المال سے

حلة فی الشتاء وحلة فی القیظ وما احج علیہ واعتمر من الظهر وقوتی وقوت اهلی کقوت رجل من قریش لا باغناهم ولا بافقرهم (ابن سعد جلد ۳ صـ ۱۹۸)

مجھے کس قدر لینا جائز ہے؟ دو جوڑے کپڑے۔ ایک سردی اور دوسرا گرمی کے لیے۔ ایک سواری جس پر میں حج اور عمرہ ادا کر سکوں اور قریش کے ایک متوسط الحال شخص کے برابر میری اور میرے عیال کی خوراک!

عمرابن العاصؓ نے حضرت فاروق اعظم کو لکھا کہ ہم نے آپ کے لیے مسجدِ جامع سے متصل مکان کی جگہ تجویز کی ہے۔ تو حضرت فاروق اعظم نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

انی رجل من الحجاز تکون لہٗ دارٌ بمصر وامرہ ان یجعلہ سوقاً للمسلمین (ابن عبدالحکیم)

میں خود تو حجاز کا باشندہ ہوں اور میرا گھر ہو مصر میں؟ اور آپ نے حکم دیا کہ اس جگہ مسلمانوں کے لیے بازار بنایا جائے۔

فلسفۂ اشتراکیت

اصلاحِ معاشیات کی ناکام کوشش

زمانۂ حاضر میں معیشت کا مسئلہ کچھ اس طرح پیچیدہ ہو گیا ہے کہ علماء ومفکّرین کی پیہم کوششوں کے باوجود کسی طرح سلجھنے میں نہیں آتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ کچھ زیادہ مشکل نہیں، بلکہ اسے مشکل بنا دیا گیا ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ حیاتِ انسانی کا ایک ذیلی مسئلہ ہے یعنی انسانی زندگی کا اصل مقصد خورد و نوش نہیں بلکہ اس سے بہت بلند ہے۔

ع مقصدے از آسماں بالا ترے

یعنی معیشت کا مسئلہ انسان کے اصل نصب العین کے لیے ایک ذریعہ تو ہے لیکن خود مقصود بالذّات نہیں، مگر کارل مارکس کی شریعت نے اس مسئلہ کو اس قدر اہمیّت دے دی ہے کہ زندگی کے تمام مسائل گویا اسی نقطۂ مرکز کے گرد چکّر کاٹ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شریعت کے پیروؤں نے اپنی تمام تر توجّہ معاشی سوال پر مرکوز کر دی ہے، اور اس موضوع پر بڑی بڑی مجلّدات تصنیف کی گئی ہیں اور سینکڑوں عجیب و غریب اصطلاحیں گھڑی گئی ہیں جو عوامی طبقوں کے لیے خاص طور پر جاذبِ توجہ ہیں۔

علم النفس (سائکالوجی) کی یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کتنی ہی غیر ضروری ہو مگر جب پروپیگنڈے کے زور سے اس کی وقعت کو بڑھا دیا جاتا ہے تو انسانی طبیعتیں سرعت کے ساتھ اس کی جانب مائل ہونے لگتی ہیں اور یہ میلانِ طبیعت جس قدر سخت اور مضبوط ہوتا جاتا ہے اسی تناسب سے دوسری چیزوں کی خواہش و رغبت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخیر میں وہ ایک ہی چیز طبیعتِ انسانی کی خواہشات کا مرکز بن جاتی ہے۔

کارل مارکس کا فلسفۂ اشتراکیت اسی نفسیاتی عمل پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فلسفۂ زندگی شروع سے آخیر تک انسان کے سفلی جذبات سے اپیل کرتا ہے اور اس مادی داعیۂ انسانیت کے ذریعہ دنیا میں ہمہ گیر انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔

دراصل کارل مارکس کو یقین تھا کہ دنیا کے انسانوں کو پیٹ کے مسئلہ پر ہی اکٹھا کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس کے ذہن میں کوئی ایسا ہمہ گیر الہیاتی نظریہ نہیں تھا جو دنیا کے تمام انسانوں میں اتحادِ فکر و عمل پیدا کرسکتا ہو اور اس کی نگاہ میں مادّی احساس ہی انسانوں میں یک جہتی پیدا کرسکتا تھا اس لیے اس نے انسان کی اسی رگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

دراصل انسان کچھ ایسا لالچی اور خود غرض واقع ہوا ہے کہ اس نے بیشتر مادّی ضرورتوں ہی کو مدارِ زندگی قرار دیا ہے اور روحانی ضرورتوں کو اس نے اکثر نظرانداز کردیا، کیونکہ اس کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ جسمانی اذیتیں اس کے سہل پسندانہ مزاج پر غیر معمولی حد تک اثرانداز ہوتی ہیں اور وہ جسمانی

کوفت کو برداشت کرنے میں انتہائی بزدل واقع ہوا ہے۔ اس لیے اس کی دماغی صلاحیتیں صرف مادّی عوائق و موانع کی مدافعت میں صرف ہوتی ہیں اور روحانی ضرورتوں کی طرف اس کا ذہن بہت کم منتقل ہوتا ہے۔ کیونکہ روحانی غذا نہ ملنے سے اسے کوئی جسمانی اذیت نہیں پہنچتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج مادّی ضرورتوں کا احساس اس قدر غالب آگیا ہے کہ زندگی کے دوسرے عناصر کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہے اور صرف مسئلہ معیشت ہی کو مرکز توجہ بنا لیا گیا ہے۔

کارل مارکس کے مادّی نظریۂ تاریخ کا پس منظر یہی ہوس پرستانہ جذبہ ہے جس نے اس کی دماغی جولانیوں کو صرف پیٹ کی حدود میں مقیّد کر دیا ہے اور اسے پوری تاریخ انسانی میں معاشی داعیات و احساسات کے سوا کوئی چیز نظر ہی نہ آسکی۔

اس مادّی شریعت کے پیرو آج دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں جن کا ایمان اور مذہب صرف روٹی ہے۔ یہ لوگ ہر قوم میں بکثرت ملتے ہیں مگر ہمیں سب سے زیادہ ان مسلمانوں پر حیرت ہوتی ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے اس ذلیل مادّی فلسفۂ زندگی کے پیرو بن گئے ہیں۔ حالانکہ اسلام اپنے بیشمار محاسن کے علاوہ معاشی مسئلہ کو بھی اشتراکیت سے ہزار درجہ بہتر طریق پر حل کر سکتا ہے۔ مگر اصل ہیں اس طرز پر سوچنے والے لوگ اسلامی نظریۂ معیشت سے قطعی طور پر جاہل ہیں اور ہیگل، مارکس اور لینن کے مدرسۂ فکر (سکول آف تھاٹ) کے شاگرد ہیں اور وہ اندھا دھند ان کی ہر بات پر ایمان لانا ضروری خیال کرتے ہیں۔

ان لوگوں میں دو گروہ ہیں، ایک گروہ وہ ہے جو اعلانیہ مذہب سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور مذہب کو نظام سرمایہ داری کا آلہ کار خیال کرتا ہے۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو بدقسمتی سے اتنی جرأت کا مالک نہیں کہ وہ مذہب کا طوق گلے سے اتار پھینکے اور کھلے بندوں اپنے نامسلمان ہونے کا اعتراف کر لے۔ اس گروہ کی منافقانہ سرگرمیاں ملتِ اسلامیہ کے لیے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہیں بالخصوص جبکہ اس گروہ میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو بظاہر مومنانہ شکل و صورت رکھتے ہیں اور عالم دین ہونے کے بھی مدعی ہیں۔ یہ لوگ آیاتِ قرآنی کی تحریف میں انتہائی دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے کتاب اللہ کو اصولِ اشتراکیت پر منطبق کرنے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں۔

کسی گذشتہ بحث میں اشتمالیت (کمیونزم) کے بنیادی تصورات پر اجمالی تبصرہ کیا جا چکا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اشتراکیت شروع سے اخیر تک اسلام سے کلّی تضاد رکھتی ہے اور اسلام کا فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے بالکل جداگانہ اور مستقل بالذّات حیثیت رکھتا ہے اور ہم اسلام کو کسی دوسرے نظریۂ زندگی کا سہارا لیے بغیر اسلام ہی سے پہچان سکتے ہیں یعنی اسلام خود ہی اپنے متن کا شارح ہے اور اس کی شرح کے لیے ہمیں کسی دوسری جانب رُخ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

کارل مارکس کے فلسفۂ اشتراکیت کے تمام اجزاء و مراتب مثلاً تاریخ کی مادّی تعبیر یا ارتقاءِ تمدّن کا مادّی نظریہ، طبقاتی نزاع، نفی ملکیت ذاتی، مثالی سوسائٹی اور نفی حکومت و ریاست کے تصورات پر اگر مسلمان کی حیثیت سے

غور کیا جائے تو ان میں کوئی ایک نظریہ بھی ایسا نہیں جو اسلام کے کسی نظریہ سے کوئی مشابہت رکھتا ہو۔

یہاں اس بحث میں الجھنے سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، کیونکہ ہمارا موضوعِ بحث اسلامی نظامِ معیشت کی توضیح ہے اور نظامِ اشتراکیت کے اجزاءِ فکر و عمل پر بحث کرنا ہمارے اصل موضوع سے غیر متعلق ہے۔ تاہم چونکہ خود مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ ہے جو فلسفۂ اشتراکیت پر ایمان رکھتا ہے اور اشتراکی نظام کی مزعومہ حریت و مساوات سے اس قدر متاثر ہے کہ وہ اسلام سے بہت دور جا پڑا ہے یا اسلام کے نظریۂ اجتماع کی تفسیر و تعبیر میں ہر جگہ اصولِ اشتراکیت کو ڈھونڈنے کی عبث کوشش کرتا ہے، اس لیے اس موقعہ پر اشتراکیت کے چند اجزاء پر بحث کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

تاریخ کا مادّی نظریہ

کارل مارکس نے اپنے نظریۂ تاریخ یعنی تاریخ کی مادّی تعبیر (میٹیریلیسٹک انٹرپریٹیشن آف ہسٹری) کی اساس پر ایک مستقل فلسفۂ اجتماع کی تعمیر کی ہے اور اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں صرف داعیۂ معیشت ہی کارفرما رہا ہے۔ دنیا کے سوانح عظیمہ اور سرگذشت اقوام کی تہ میں اگر کوئی حقیقی علّتِ موثرہ ہے تو وہ صرف انسان کے معاشی دواعی محرکات ہیں۔ مذہب و تہذیب اور دوسرے عوامل اس کے نزدیک محض سطحی حیثیت رکھتے ہیں اور اقوامِ عالم کی کشمکش میں ان چیزوں کو محض نمائشی درجہ حاصل رہا ہے، یعنی مذہب و تہذیب کو ہمیشہ معاشی مفادات کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے اور حقیقت میں داعیۂ معیشت

ہی عالم انسانی کو تہ و بالا کرتا رہا ہے۔ گویا انقلابات عالم اسی پُر اسرار پیڑی کی مختلف ارتقائی منزلیں ہیں۔ کارل مارکس اسی تصور تاریخ کو مادّی نظریۂ تاریخ سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ نظریہ دراصل ہیگل کے فلسفۂ اضداد یا نظریۂ جدلیت سے ماخوذ ہے فرق اتنا ہے کہ ہیگل کے نزدیک یہ جدلی عمل تصوّرات کی دنیا میں جاری رہتا ہے، یعنی جب ایک تصور ایک خاص حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک جدید تصور پیدا ہوتا ہے جو پہلے تصوّر کی ضد ہوتا ہے۔ مگر یہ دوسرا تصوّر پہلے تصوّر کے صالح اجزاء کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور اس کے فاسد و ردی اجزا کو فنا و عدم کی نذر کر دیتا ہے۔ اس طرح ایک نئے صالح تصور کا وجود عمل میں آتا ہے۔ اب جب یہ نیا تصوّر بھی ارتقا کی آخری منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے بطن سے ایک اور تصور پیدا ہوتا ہے جو پہلے تصوّر کی صداقتوں کو حاوی ہوتا ہے۔ غرض یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

ہیگل کے نزدیک انسان کی پوری تاریخ اسی جنگ اضداد کا دوسرا نام ہے اور اس کے خیال میں تصورات کی یہ جنگ حیات انسانی کی اصل فطرت ہے اور اسے بہرحال جاری رہنا چاہیئے۔ ہر دوسرا تصوّر پہلے تصور کے محاسن کو ساتھ لے کر عالم وجود میں آتا ہے اور پہلے تصوّر کے فاسد اجزا فنا ہو جاتے ہیں اور ہر پہلے تصوّر کا قیمتی جوہر ایک سے دوسرے تصور میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ اس عمل مسلسل کے اخیر میں ایک جامع اور مکمل تصوّر عالم وجود میں آئے گا جس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہ ہو گی یہاں

پہنچ کر "تصورِ مطلق" یا" روحِ مطلق" (جو ہر دور کے متفاوت اجزاء تصور کی ہم آہنگی سے عبارت ہے) صحیح معنوں میں درجۂ کمال تک پہنچ جائے گا۔

ہیگل کے نزدیک انسان کا خارجی ماحول اور تمام سماجی تبدیلیاں دراصل تصورات کے نزاع و تصادم کی نشان دہی کرتی ہیں، یعنی اولاً و بالذات یہ جنگ تصورات میں ہوتی ہے اور تصور کے ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرہ بھی بدلتا چلا جاتا ہے۔

کارل مارکس نے اگرچہ نظریۂ اضداد کی صحت کو تسلیم کیا ہے مگر ساتھ ہی اس کے مفہوم و مصداق کو بالکل بدل دیا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک یہ جنگ تصورات کی بجائے معیشت کے میدان میں لڑی جاتی ہے، جب کوئی معاشی نظام ہر حدِ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے اس کی مخالف قوتیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور یہ قوتیں جوان ہو کر اس نظام کو فنا کر دیتی ہیں اور ایک نیا نظامِ معیشت عالمِ وجود میں آتا ہے جس میں پہلے نظام کے تمام صالح اجزا موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب یہ نظام بھی آخری منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر بھی متضاد قوتیں نشو و نما پانے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک تیسرا نظام وجود میں آتا ہے۔ وھلم جرا۔

کارل مارکس کے نزدیک تاریخ کا ہر نیا دور پہلے دور کی نسبت مہذب اور تربیت یافتہ ہوتا ہے اور ہر جدید نظامِ معیشت پہلے دور کی صداقتوں کا حامل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ جدید سائنٹیفک آلات سے بھی آراستہ ہوتا ہے۔ یہ ارتقائی عمل اسی طرح جاری رہتا ہے۔ مگر جہاں ہیگل کے نزدیک

ارتقاء تصوّر کی انتہا تصوّرِ مطلق کی تکمیل پہ ہوتی ہے، کارل مارکس کے نزدیک تمدنی اور معاشرتی ارتقاء ایک مثالی سوسائٹی پر رک جاتا ہے۔ یہ مثالی سوسائٹی (آئیڈیل سوسائٹی) کارل مارکس کے خیال میں ایک معصوم اور منزہ عن الخطا انسانی سماج ہوگا، جس میں کسی طرح کا عیب و نقص نہیں ہوگا اور اس مرحلہ پر انسانی سوسائٹی کے لیے حکومت و ریاست (سٹیٹ) کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

مگر اس مثالی حالت (آئیڈیل سٹیٹ) سے پہلے تاریخ کے ہر دور میں رائج الوقت نظام کے تحت دو متضاد انسانی گروہ موجود ہوتے ہیں، ایک گروہ رائج نظام پر حاوی ہوتا ہے اور تمام پیداواری قوتوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔ اس گروہ کو "سرمایہ دار طبقہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے' اور دوسرا گروہ ان فاقہ مست انسانوں کا ہے جو معاشی لحاظ سے پہلے طبقہ کا دست نگر ہوتا ہے۔ اسے مزدوروں کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ ان دونوں طبقوں کے مفادات باہم متصادم ہوتے ہیں۔ اول الذکر طبقہ دوسرے طبقہ کو ہر ممکن ذریعہ سے اپنا زیرنگیں اور محکوم رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی محنت و جانفشانی سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور دوسرا طبقہ پہلے طبقہ کے جبر و تشدد سے نجات حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ثانی الذکر گروہ ایک خاص قوت پیدا کر لیتا ہے تو وہ رائج الوقت نظام کے خلاف ایک منظم جد و جہد شروع کر دیتا ہے اور بالآخر ایک ہی جھٹکے سے اس فاسد نظام کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ اب اس معاشی انقلاب کے بعد ایک نیا نظامِ معیشت بروئے کار

آجاتا ہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کے ساتھ بھی پہلے کا سا حشر ہوتا ہے۔
اس نزاعی عمل کو جو انسان کے دو طبقوں میں جاری رہتا ہے۔ کارل مارکس
طبقاتی نزاع (کلاس سٹرگل) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

غرض اس جدلی عمل کا محل اوّل کارل مارکس کے نزدیک انسان کا
خارجی ماحول یا نظام معیشت ہے اور اس کے ارتقا کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات
اور تہذیب و اخلاق اپنا قالب بدلتے چلے جاتے ہیں اور ہر زمانہ کا مخصوص
معاشی نظام ایک نئے اندازِ فکر اور جدید اخلاقی قدروں کی تخلیق کرتا ہے۔
علوم و فنون، تہذیب و سیاست اور اخلاق و تمدن معاشی رفتارِ ترقی کے
ساتھ ساتھ بدلتے چلے جاتے ہیں اور ان کو کوئی مستقل بالذّات حیثیت حاصل
نہیں۔ گویا کارل مارکس کے نزدیک انسانی ضمیر اور فکر محض تابع مہمل کی حیثیت
رکھتا ہے اور خارجی ماحول جس طرف چاہے اس کے رُخ کو پھیر سکتا ہے اور
حقیقت میں داعیۂ معیشت ہی زندگی کے تمام شعبوں پر حکمرانی کرتا ہے۔

کارل مارکس کا یہ فلسفۂ تاریخ محض سطحی اور عامیانہ دلائل پر مبنی ہے
اور ہم اس کے لیے اگر نرم سے نرم الفاظ بھی استعمال کریں تو اتنا ضرور کہنا
پڑے گا کہ فلسفۂ اشتراکیت اس مشہور ضرب المثل "دو اور دو چار روٹیاں"
کا صحیح مصداق ہے۔

دراصل کارل مارکس اور اس کے دوسرے رفقائے کار اینجلس وغیرہ
جس زمانہ میں پیدا ہوئے وہ معاشی اور سیاسی اعتبار سے غصب حقوقِ
انسانی اور جبر و استبداد کا بدترین دور تھا۔ بالادست اور اقتدار پسند طبقوں کی

ہوسناکیاں اور چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں اور مارکس و اینجلس کی آنکھوں نے جبر و تشدد اور غصب و نہب کے سینکڑوں واقعات دیکھے اور ان دردناک واقعات نے ان کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر پیدا کیا کہ انھوں نے دنیا کی ہر چیز سے توجہ ہٹا کر رائج الوقت معاشی نظام کو ختم کرنے اور ایک جدید معاشی انقلاب پیدا کرنے کی جد و جہد شروع کر دی۔

انسان خواہ کتنا ہی وسیع الخیال اور بالغ النظر ہو، مگر جب کسی شدید صدمہ سے اس کا دل متاثر ہو جاتا ہے تو اس کی توجہ سمٹ کر اپنے لیے ایک محدود دائرہ بنا لیتی ہے اور وہ صرف علّتِ موثرہ کی مدافعت میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے اور چونکہ معاشی نظام کی ابتری ہی نے مارکس کے دل و دماغ کو ماؤف کیا تھا اس لیے اس نے پورے فلسفۂ زندگی کے لیے اسی مسئلہ کو اصل اور بنیاد قرار دے دیا اور اسی تاثر کی حالت میں جب اس نے پیچھے کی طرف دیکھا تو پوری انسانی تاریخ میں اسے بھوکوں کی آہ و پکار اور رنج و الم کے سوا کوئی چیز نظر نہ آئی، اس لیے اس نے اسی تصور پر ایک مستقل فلسفۂ زندگی کی تعمیر شروع کر دی۔

دراصل یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ ہر زمانہ کا معاشی نظام فکر و ذہن، علم و فن اور اخلاق و مذہب کے دوائر متعین کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے یعنی تطہیرِ فکر اور تعمیرِ فکر کسی نظام کی تشکیل و تعمیر میں علتِ موثرہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی نظامِ معیشت و سیاست کے عالم

وجود میں آنے سے پہلے اس کا ذہنی وجود از بس لازمی ہے۔ یہ ذہنی وجود ہی اس کے خارجی وجود کی ہیئیات و اشکال متعین کرتا ہے اور نظام تمدن کا پورا نقشہ، اپنے نظریاتی وجود کا عکس ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ کسی نظام سیاست و معیشت کا خارجی وجود دفعۃً درجۂ تکمیل کو پہنچ جائے، ہوسکتا ہے کہ اس کی تکمیل میں مدتیں صرف ہو جائیں، کیونکہ ہر نظام کے خارجی وجود کو مادی موانع و عوائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور جب تک یہ اپنی مخالف قوتوں پر غالب نہ آجائے اس وقت تک عالم مادی میں اس کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ مگر اتنا ضروری ہے کہ ہر نظام کا بنیادی تصور یقیناً پہلے اذہان میں موجود ہوتا ہے۔

یہ بنیادی تصور دو قسم کا ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ وحی الہام کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کے قلوب میں القا ہو۔ اور یہ الہامی نظریۂ زندگی ماحول کی ضرورتوں کے اعتبار سے بالکل جامع اور مکمل ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ خود عقل انسانی نے اسے اختراع کیا ہو۔ یہ تصور بہرحال ناقص، ادھورا اور نامکمل ہوتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر خارجی نظام اپنے ذہنی اور نظریاتی وجود کا تابع ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ اس کے لئے براہین و دلائل کی قطعاً ضرورت نہیں۔ انقلاب فرانس ہی کے محرکات و دواعی پر اگر متانت سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت اُبھری ہوئی نظر آئے گی، کہ روسو اور والٹیر ایسی انقلابی شخصیتوں نے سب سے پہلے اپنے لٹریچر کے ذریعہ عوام کے فکر و

ذہن میں تبدیلی پیدا کی اور جس نوعیت کا انقلاب وہ پیدا کرنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے پہلے سے دلوں کی زمین کو ہموار کیا۔ ان کی انقلابی تصانیف نے عوامی طبقوں میں روحِ حیات پھونک دی۔ اور یہ ذہنی انقلاب بالآخر ایک خارجی انقلاب پر منتج ہوا۔

دور جانے کی ضرورت نہیں، مارکس اور ان کے رفقاء نے بھی تو یہی کچھ کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے نظری حیثیت سے حالات کا جائزہ لیا اور پھر ایک جدید فلسفۂ زندگی سے لوگوں کو روشناس کیا۔ یہ ذہنی انقلاب جب ایک حد تک مکمل ہو چکا تو اس کے بعد انھوں نے زارِ روس کے ظالمانہ نظام کو بدل ڈالا۔

غرض دنیا میں جب بھی کوئی نیا نظام پرانے نظام کی جگہ لیتا ہے تو وہ نظام پہلے نظری حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے حسن و قبح کو عقل کے معیار پر پرکھا جاتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ نیا نظام عالمِ غیب سے آکر دفعۃً لوگوں پر مسلط ہو جائے اور پھر وہ اپنی پسند کے مطابق ایک نیا مذہب اور نئی اخلاقی قدریں متعین کرے اور زندگی کے دوسرے مسائل کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔

اسلام چونکہ ایک خدائی فلسفۂ زندگی ہے اس لیے یہ نظریاتی طور پر روزِ اوّل ہی سے جامع اور مکمّل ہے، البتہ عملی حیثیت سے زمانۂ رسالت کے بعد صرف تیس سال کے لیے اپنی صحیح شکل میں نفاذ پذیر ہوا اور اس کے بعد جاری نہ رہ سکا، کیونکہ یہ ہمہ گیر اور محیط کل نظریۂ حیات ہے اور

جب تک پوری کائنات انسانی میں ایک ہمہ گیر فکری انقلاب رونما نہیں ہو جائے گا اور انسان کا شعور ذات درجۂ تکمیل تک نہیں پہنچ جائے گا اس وقت تک اس کا نفاذ و اجرا نہیں ہو سکے گا، البتہ خلافتِ راشدہ کا سی سالہ عہد عالمِ انسانی کے لیے ایک مثالی حالت (آئیڈیل سٹیٹ) کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر انسان اپنی جدوجہد جاری رکھ سکے۔

مسلمانوں نے دنیا میں جس رنگ کا انقلاب بپا کیا اس کا ذہنی نقشہ ان کے قلوب و اذہان میں موجود تھا، رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مخصوص دعوت سے پہلے انسانی ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا کی، مکۂ معظمہ کی تیرہ سالہ جدوجہد تطہیر فکر کے لئے تھی اور اس کے بعد تعمیر فکر کا کام شروع ہوا، اور ہجرت کے آٹھویں سال اسلامی فلسفۂ زندگی نظری حیثیت سے مکمل ہو گیا تھا جبکہ خدائے قدوس کی طرف سے یہ اعلان ہوا: الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (الآیہ) غرض یہ کہ جس نظامِ زندگی کو دنیا پہ عملاً نافذ کرنا تھا سب سے پہلے اسے انسانی قلوب میں اُتارا گیا اور پھر اس ذہنی نقشہ کے مطابق خارجی ماحول کی تعمیر ہوئی۔

کارل مارکس کا یہ خیال کہ دنیا کے واقعات کی تہ میں صرف معاشی ضرورت ہی کار فرما رہی ہے ایک ایسا سفید جھوٹ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں ہو سکتا، افسوس ہے کہ اس شخص نے انبیاء و رسل کے طریقِ دعوت اور تاریخِ اسلامی کا بغور مطالعہ نہیں کیا ورنہ اسے یہ نظریہ قائم کرنے کی جراُت نہ ہوتی۔ انبیاء و رسل اور ان کے سچے متبعین نے مادی خواہشات

سے کبھی سروکار نہیں رکھا اور ان کی مقدّس زندگیاں ایک اعلیٰ و برتر مقصد کے لیے وقف رہیں، وہ کئی کئی دن بھوکے رہے مگر اپنے فرض منصبی سے ایک لمحہ بھی غافل نہ ہوئے۔ گالیاں کھائیں، طعنے سُنے، اذیتیں برداشت کیں اور وہ کون سی مصیبت ہے جو انھوں نے راہِ حق میں برداشت نہیں کی سہ

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں   ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

ان کے جسمِ اطہر میں لوہے کی میخیں ٹھونکی گئیں اور بدن کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا، مگر اس حالت میں بھی وہ ثابت قدم رہے بلکہ ان کی زبان سے کبھی حرفِ شکایت تک نہ نکلا سہ

کمالِ مرتبۂ عشق آں بود جامی   کہ جاں سپارد و اظہار مدعیٰ نہ کند

حکومت و سرداری کی پیشکش کی گئی، دولت و زر کے ڈھیروں کا لالچ دیا گیا مگر انھوں نے بھوک اور تنگدستی کو ہمیشہ سرمایہ و دولت پر ترجیح دی۔ اور ان معصوم الفاظ میں منکرین سے خطاب کیا۔

لَا اَسْئَلُکُمْ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (ہود)   میں تم سے مال و دولت نہیں مانگتا میری اجرت تو اللہ کے پاس ہے۔

یہی حال انبیاء علیہم السلام کے متبعین کا ہے، مگر اتنی گنجائش نہیں کہ میں اس موقع پر تاریخ اسلامی کے ان مقدس واقعات کا ذکر کروں۔

یہ تو اسلامی نقطۂ نظر سے کہا گیا ہے لیکن اس سے قطع نظر جب تاریخ عالم (ہسٹری آف ورلڈ) پر سنجیدہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ تاریخی واقعات میں معاشی ضرورت کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں کارفرما رہی ہیں جو

قوموں کو جنگ کے لیے آمادہ کرتی رہی ہیں۔ اس بناء پر مارکس کا نظریۂ تاریخ ایک نہایت مہمل نظریہ ہے اور اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور اس کا فلسفۂ زندگی جو اس مہمل نظریہ پر مبنی ہے اسی شخص کے لئے قابلِ قبول ہوسکتا ہے جو عقل و خرد سے بالکل محروم ہو۔

غرض فلسفۂ اشتراکیت نے معاشی مسئلہ کو اس قدر بڑھا دیا ہے، کہ زندگی کے تمام مسائل اسی میں دب کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ حیاتِ انسانی ایک ایسی وحدت ہے جس کے اجزا میں ایک قدرتی ہم آہنگی اور ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس کے ہر جزو کے لئے ایک مخصوص مقام ہے کہ اسے ہر حال میں اسی مقام پر رہنا چاہیئے وہ اپنے اصلی موقف سے مقدّم ہوسکتا ہے نہ موخّر۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ کسی ایک جزو کو اس قدر اوپر اُٹھا لیا جائے کہ وہ دوسرے اجزائے حیات پر چھا جائے اور دیگر اجزا اس کے نیچے دب جائیں۔

درحقیقت اجزاءِ حیات کے توازن کو برقرار رکھنا انسانی زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ مگر اس کا فہم عقلِ انسانی سے بالاتر ہے۔ اور اس کے لیے انبیاء و رسل کی الہامی تعلیم کی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم نے انبیاء و رسل کی بعثت کا یہ مقصد ان الفاظ میں بیان کردیا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید)	ہم نے اپنے رسولوں کو آیات بینات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ نقطۂ عدل پر قائم ہوجائیں۔

یعنی حیاتِ انسانی کو افراط وتفریط کی راہوں سے ہٹا کر اس کے اجزا میں ربط و نظم اور ہم آہنگی پیدا کرنا انبیاء و رسل کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہے۔

موجودہ معاشی خلفشار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج معاشی مسائل کے حل کرنے کے لئے جس قدر کوششیں کی جارہی ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ مبنی بر خلوص ہوں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ان اصلاحی کوششوں کے ساتھ ساتھ تخریبی قوتیں بھی برابر اپنا کام کر رہی ہیں۔ لہٰذا ان کوششوں کی حیثیت ایسی ہے کہ کسی مکان کو آگ لگ جائے اور اسے بجھانے کے لئے تمام وسائل و ذرائع فراہم کئے جائیں مگر اس کے ساتھ دوسری طرف آگ پر تیل بھی چھڑکا جا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ آگ کو بجھانے کی یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اقوامِ حاضرہ کی اصلاحی کوششوں کا بھی بالکل یہی حال ہے۔ ایک طرف موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو مٹانے کی سعی کی جارہی ہے اور دوسری جانب ان کی باہم قومی اور وطنی رقابتیں جذبۂ سرمایہ داری کو اور زیادہ ابھارتی رہتی ہیں اور ان کے قوم پرستانہ جذبات وعواطف نے عالمِ انسانی کو کئی متضاد گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر گروہ اقتصادی اور دفاعی اعتبار سے دوسروں پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔

اشتراکیت کی ابتدا اگرچہ ایک عالمی فلسفۂ زندگی سے ہوئی تھی، اور دوسرے مفاسد و معائب سے قطع نظر اس میں یہ ایک خوبی ضرور تھی کہ اس کی بنیاد عالمگیر نظریات (یونیورسل تھیوریز) پر رکھی گئی تھی۔ مگر آج قوم پرستی (نیشنلزم) کے سیلاب نے اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور

وہ اب عالمی فلسفۂ زندگی کی وسعت کو چھوڑ کر وطنی قومیت کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ گذشتہ جنگ کے دوران میں ۶ نومبر ۱۹۴۴ء کو اسٹالن نے جو تقریر کی تھی اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

"سوویٹ حب الوطنی، نسلی تعصب پہ نہیں بلکہ جمہور روس کی اس گہری عقیدت پر مبنی ہے جو انھیں اپنی مادرِ وطن سے وابستہ رکھتی ہے"

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ اشتراکیت مادرِ وطن کی گہری عقیدت پر مبنی ہے۔ حالانکہ کسی عالمی نظریہ زندگی کو تنگنائے وطن سے نسبت ہی کیا ہے؟

؎ آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

کہا جاتا ہے کہ موجودہ معاشی بدحالی و اضطراب کی اصل وجہ دولت کی نامنصفانہ تقسیم ہے اور اصلاح حال کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوگی جب تک کہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو ختم نہ کر دیا جائے۔

اس کے ہم بھی منکر نہیں کہ اس نظامِ سرمایہ داری (کیپٹلزم) کی وجہ سے آج دنیا عذابِ الیم میں مبتلا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اور نامنصفانہ تقسیم دولت میں کون سے عوامل کارفرما ہیں اور ان کو ختم کرنے کے لیے کون سا طریق کار کارآمد ہو سکتا ہے؟

معاشیاتِ انسانی کا واحد حل

اسلام کا عادلانہ معاشی نظام

اگر یہ صحیح ہے کہ موجودہ دنیا کی معاشی بے چینی کی سب سے بڑی وجہ نامنصفانہ تقسیم دولت ہے، جسے ختم کرنے کے لیے اشتمالیت (کمیونزم) معرضِ وجود میں آئی ہے۔ تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس ظالمانہ تقسیم دولت کو کسطرح ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کے حل ہوجانے پر نظام اشتراکیت کی افادیت یا عدمِ افادیت کا خود ہی فیصلہ ہوجائے گا۔

نامنصفانہ تقسیم دولت کو ختم کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ سلب ملکیتِ ذاتی اور اصلاح ملکیتِ ذاتی۔ پہلا طریقہ وہ ہے جسے کارل مارکس نے اختیار کیا ہے اور ہم کسی گذشتہ بحث میں لکھ آئے ہیں کہ یہ طریقہ غیر فطری ہونے کے علاوہ انسانوں کے لئے سخت مضرت رساں ہے۔ نیز اس کا مآل بھی نظام سرمایہ داری سے مختلف نہیں۔ کیونکہ افراد کی ذاتی ملکیت (پراپرٹی) کی نفی کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے اس اجتماعی سرمایہ کا نگران کون ہو؟ کوئی ایک شخص یا کوئی مجلس منتظمہ اگر کسی ایک شخص کو اس سرمایہ پر مسلط کردیا جائے تو یہ صورت ملوکیت مستبدہ سے زیادہ خطرناک ہوگی۔ اور اگر کسی کارکن مجلس (اگزیکٹو) کو یہ کام سونپا

جائے تو اس کا انجام بھی بالآخر یہی کچھ ہوگا۔ کیونکہ یہ جماعت بھی آخر انسانوں کی جماعت ہوگی اور ہر وقت اس بات کا امکان ہوگا کہ چند انسانوں کی اس جماعت میں وہی سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہو جائے اور یہ انسانی طبائع سے کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں انسانی جماعتیں بلند بانگ دعاوی کے ساتھ منظر عام پر آتی ہیں جو برسر اقتدار آنے کے بعد زود یا بدیر ان دعاوی کو فراموش کر دیتی ہیں۔ لہذا اشتراکی جماعت کے متعلق یہ کیونکر فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی معصوم انسانوں کی جماعت ہے اور یہ ہمیشہ ذاتی مفاد پر اجتماعی مفادات کو ترجیح دیتی رہے گی اور اس میں آگے چل کر خود غرضانہ ذہنیت پیدا نہ ہوگی بلکہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے روس کی اشتراکی جماعت بھی اپنے اصل موقف کو آہستہ آہستہ چھوڑ رہی ہے چنانچہ شروع میں یہ جماعت ایک ہمہ گیر مقصد لے کر اٹھی تھی اور اس کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔ مگر اب وہ اپنی انٹرنیشنل حیثیت کو چھوڑ کر ایک نیشنلسٹ جماعت بن چکی ہے اور اب دیکھنا ہے کہ ملوکیت و استبداد کی خونیں قبا کب زیب تن کرتی ہے۔

رگ رگ دے پے بیچ کھائے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

لہذا نظام اشتراکیت اور نظام سرمایہ داری انجام کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ بلکہ نظام اشتراکیت، سرمایہ دارانہ نظام سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس میں ملک کی دولت بہت سے سرمایہ دار بنیوں کے قبضہ سے نکل کر بنیوں کی ایک مختصر جماعت کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح ملک کا سرمایہ افراد انسانی میں پھیلنے کے بجائے اور زیادہ سمٹ جاتا ہے۔ اس بنا پر ظالمانہ تقسیم دولت کے تمام وسائل و ذرائع کو ختم کرنے کے لیے دوسرا

طریقہ (ضبط و اصلاح ملکیتِ ذاتی) ہی کارآمد ہو سکتا ہے۔ اور یہی کامیاب اور عادلانہ طریقِ اصلاح ہے۔ اور اسلام کا معاشیاتی نظام اسی فطری اصول پر مبنی ہے۔

اسلام اور معیشت کی تحدید و تعدیل

معیشت کو تین حالتوں یا شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وسائلِ پیداوار، مصارفِ مال اور اکتناز۔ معیشت کی ان تینوں حالتوں میں اسلام ایک نہایت سادہ اور معتدل روش رکھتا ہے۔ اور پھر اسلام نے ان تینوں شعبہ ہائے معیشت کے دوائر متعیّن کر دیے ہیں اور ہر شعبہ کو اپنے مخصوص الٰہیاتی اصولوں اور اخلاقی قدروں کے ماتحت اس طرح منضبط کر دیا ہے کہ وہ معیّن حدود سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور ہر شعبہ میں اس امر کی خاص رعایت کی گئی ہے کہ دولت چند افراد میں سمٹنے کے بجائے عام افرادِ انسانی میں زیادہ سے زیادہ بڑھے اور پھیلے۔ یہی اسلام کی بنیادی اور اہم قدر ہے جو اس کے پورے معاشی نظام میں جاری و ساری ہے۔

ذرائع پیداوار

اس سے قبل تحریر کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے وسائلِ پیداوار کی تخلیق و توسیع اور طلبِ حلال کی راہ میں تگ و دو کرنے کو ایک مقدّس فریضہ قرار دیا ہے

ان اللّٰہ یحب العبد المحترف۔	اللہ تعالیٰ محنت و مشقت اٹھانے والے شخص سے محبت کرتا ہے۔
(اخرجہ الطبرانی والبیہقی عن نافع ابن خدیج)	
اطلبوا الرزق فی خبایا الارض۔	طلبِ رزق کے لیے زمین کے اطراف و جوانب میں پھیل جاؤ۔
(اخرجہ ابو یعلی فی مسندہ والطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی شعب الایمان)	

لیکن جہاں ذرائع پیداوار کی توسیع پر اتنا زور دیا گیا ہے وہاں ہر طرح کی جد وجہد کو اخلاقی قیود و اقدار میں جکڑ دیا ہے۔ جس سے وہ تمام ذرائع معیشت ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جن سے دولت عام انسانوں میں پھیلنے کے بجائے چند افراد میں سکڑ جاتی ہے یا جن سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ غصب و خیانت، احتکار و تسعیر، اکتناز اور سود کی قسم کے تمام وسائلِ معیشت اسی لیے حرام قرار دیئے گئے ہیں کہ ان سے دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اور نظام سرمایہ داری (کیپٹلزم) کو تقویت پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب و سنت میں ہر جگہ رزق اور مال کو حلال اور طیب کی قیود سے مقید کیا گیا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (آیہ)	اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے پاکیزہ چیزیں استعمال کرو۔
امرت الرسل ان لا تاکل الا طیبا ولا تعمل الا صالحاً (اخرجہ الطبرانی والحاکم)	میں نے (اللہ تعالیٰ) رسولوں کو حکم دیا کہ وہ صرف پاکیزہ چیزیں کھائیں اور نیک کام کریں
لا یدخل الجنۃ لحم نبت من سحت (اخرجہ الطبرانی عن ابن عباس)	رزقِ حرام سے جو گوشت پیدا ہوا ہے وہ کبھی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

اس اصل معیشت کے ماتحت مروجہ ذرائع پیداوار میں سے بہت سے ایسے ذرائع ہیں جن کو اسلامی نظام معیشت میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے حرام قطعی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام نے ہر اس چیز کی تجارت ممنوع قرار دی ہے جس کا کھانا پینا حرام ہے۔

لا یحل ثمن شیئ لا یحل اکلہ و شربہ	کسی ایسی چیز کی قیمت لینا جس کا کھانا

یا پینا حرام ہے، جائز نہیں ہے ۔ (اخرجه الدار قطني عن تميم الداري)

اس ضمن میں شراب اور دوسری منشیات، نیز کتا، خنزیر، اور دوسرے تمام حرام جانوروں اور دیگر حرام اشیاء کی تجارت ممنوع ہے ۔

اسی طرح بہت سے صنائع (آرٹس) بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں مثلاً تصویر کشی کی حرمت متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے ۔

اشد الناس عذاباً يوم القيامة المصوّرون (اخرجه احمد في مسنده ورواه مالك ومسلم والنسائي والترمذي قريباً منه)

تصویر کشی کرنے والوں کو قیامت میں سب سے زیادہ عذاب دیا جائے گا ۔

گانے بجانے کے ساز بنانا اور ان کو استعمال کرنا بھی ممنوع ہے ۔

سوء الكسب اجرة الزمارة و ثمن الكلب (ابوبكر ابن مقسم عن ابي هريرة)

گانے بجانے کی اجرت لینا سب سے بُرا کسب ہے ۔

نیز احتکار و تسعیر کی تحریم سے پیداوار کے وہ تمام ذرائع حرام ہو گئے ہیں جن میں دولت اس مقصد کے لیے جمع کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وسائل معیشت پر قبضہ کیا جائے ۔

المحتكر ملعون (رواه ابن ماجه عن عمرؓ) احتکار کرنے والا لعنتی ہے ۔

سود کی حرمت سے سرمایہ داری کے اڈے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں اور اسلام میں ہر ایسی تجارت اور لین دین سے احتراز کرنے کی تاکید کی گئی ہے جس میں سود کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی موجود ہو ۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ ارشاد فرماتے ہیں :

ترکنا تسعة اعشار الحلال مخافة الربا — ہم نے سود کے خوف سے حلال کے نو حصے بھی چھوڑ دیے ہیں۔

(اخرجہ عبدالرزاق فی الجامع)

جمع دولت یا اکتناز

ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے کوئی شخص اتنی دولت جمع کر ہی نہیں سکتا، جو اس کی ذاتی ضرورتوں سے زائد ہو اور اس کے ذریعہ دوسروں کے وسائل معیشت پر قبضہ کر سکے اور اگر کوئی شخص اصل ضرورت سے زائد دولت جمع کر لے تو وہ فریضۂ زکوٰۃ عام صدقات اور قانونِ وراثت کے ذریعہ کئی انسانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک شخص کے پاس اگر لاکھ روپیہ ہے تو اسے ہر سال تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ دینا پڑتا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہیں، جن کا ادا کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔

انّ فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ — مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے حقوق بھی ہیں۔

(اخرجہ الترمذی)

قانونِ وراثت کے ذریعہ ایک شخص کی دولت کئی افراد میں تقسیم ہو جاتی ہے اگر قریبی رشتے دار نہ ہوں تو دور کے رشتہ داروں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اور اگر کوئی رشتہ دار نہ ہو تو وہ بیت المال میں جمع کی جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ مصالحِ عامہ کے کام آتی ہے۔

امراء پر اس قدر صدقات فرض کر دیے گئے ہیں جو غربا کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔

عن علیؓ قال ان اللہ فرض علی الاغنیاء — اللہ تعالیٰ نے طبقۂ امرا پر اس قدر صدقات

فی اموالھم مایکفی فقراھم وان جاعوا وعروا وجھدوا فلمنع الاغنیاء (اخرجہ البیہقی)

فرض کر دیئے ہیں جو غربا کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ لوگ بھوکے، ننگے اور مبتلائے مصیبت ہوں تو یہ امراء کے بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

زمین کی کاشت کے سلسلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ کوئی شخص ضرورت سے زائد اپنے پاس زمین نہیں رکھ سکتا۔ صرف اتنی زمین ہی قبضہ میں رکھ سکتا ہے جس کی وہ خود کاشت کر سکتا ہو۔

اذا کانت لاحدکم ارض فالیمنحھا اخاہ اولیزرعھا (اخرجہ الترمذی)

اگر تم میں سے کسی ایک کے پاس زائد زمین ہو تو اس کو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو بخش دے۔

اس سے موجودہ زمینداری خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔

مصارف دولت

تیسرا شعبہ صرف دولت کا ہے اور اس پر بھی اسلام نے اسی طرح کی اخلاقی پابندیاں عائد کر دی ہیں، اور دولت کو کسی ایسے مصرف میں خرچ کرنے سے منع کر دیا گیا ہے جس سے عائلی یا ملی ضرورتوں کی تکمیل نہ ہوتی ہو۔ بلکہ صرف ہوائے نفس کی تکمیل یا دوسروں کے وسائل معیشت پر قبضہ جمانا مقصود ہو۔

موجودہ فاسد نظام کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ امراء کی دولت عیش و عشرت اور غیر ضروری مقاصد کے لیے خرچ ہوتی ہے اور جہاں اسے خرچ کرنا چاہیئے وہاں خرچ نہیں کی جاتی۔ مگر اسلام نے صرف دولت کے لیے بھی حدود مقرر کر دی ہیں جس سے امرا کی دولت ناجائز مصارف سے

بچ کر مصالح عامہ کی تکمیل کے کام آتی ہے۔

قرآن حکیم نے صرف دولت کے سلسلہ میں معتدل راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (آیہ)

اور وہ لوگ جو خرچ کرتے وقت اسراف اور بخل سے الگ ایک درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (آیہ)

فضول خرچی کرنے والے لوگ شیطان کے بھائی ہیں۔

من فقہ الرجل رفقہ فی معیشتہ (اخرجہ الطبرانی عن ابی الدرداء)

معیشت میں میانہ روی اختیار کرنا انسان کی عقلمندی ہے۔

جہاں عیش و عشرت کے سازوسامان اور زائد از ضرورت مصارف میں مال کو خرچ کرنے کی سخت ممانعت کردی گئی ہے، وہاں غربا و مساکین کی امداد و اعانت اور محتاجین کی حاجت روائی کے لیے خرچ کرنے کی شدید تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ جو چیز آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اسے اللہ کی راہ میں محتاجوں پہ خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ (آیہ)

تم نیکی کو ہرگز نہ پاسکوگے تاوقتیکہ اپنے محبوب ترین مال میں سے اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کروگے

اور فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے دولت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے کیونکہ اس سے سوسائٹی میں ایک معتدل اور مساویانہ حالت پیدا ہوجاتی،

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۔ (سورۂ سبا)

تم اللہ کے راستہ میں جو مال صرف کرو گے اللہ اس کا نعم البدل تمہیں عطا فرمائے گا۔

صرف دولت کے سلسلہ میں اس قدر احتیاط برتنے کی تاکید کی گئی ہے کہ اسے زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ قرار دے دیا گیا ہے۔ صحاح کی ایک مشہور روایت میں ہے کہ قیامت کو چار باتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور جب تک ان چار باتوں کا جواب نہ دیا جائے گا اس وقت تک انسان کو پاؤں پر کھڑا رہنا پڑے گا۔ ان چار سوالوں میں سے ایک سوال یہ ہے :

من این اکتسبتم وفیما انفقتم (صحاح) تم نے کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا۔

ان حقائق کے پیش نظر اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اسلام جس طرح کی انسانی سوسائٹی کی تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ہر شخص کی معاشی زندگی اخلاقی اور مابعد الطبعیاتی قیود میں جکڑی ہوئی ہوگی اور فرد یا جماعت کو مقررّہ حدود سے ایک انچ بھی آگے بڑھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اور معاشی مساوات کا یہ عالم ہوگا کہ پوری اسلامی قلمرو میں کوئی ایک شخص بھی بھوکا اور تنگدست نظر نہ آئے گا۔ اور چونکہ پوری اسلامی سوسائٹی خدائی ضابطۂ اخلاق کی پابند ہوگی اس لیے اس بات کا کوئی خطرہ نہ ہوگا کہ کوئی ایک شخص یا انسانوں کی کوئی جماعت عوام کی آزادئ فکر اور مساواتِ عامّہ کو سلب کر سکے۔

غرض اسلام ملکیتِ ذاتی (پرایرٹی) اور دیگر معاشی بداعتدالیوں کی جس طرح اصلاح کرتا ہے اور معاشیاتِ انسانی کو جس معتدل راستہ پر چلانا چاہتا ہے اس سے یقیناً تمام معاشی الجھنوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے ۔

حکومتِ اسلامی کی سیاستِ مالیہ میں معیشت کا صحیح مقام

چیز کوئی بھی ہو، اگر جب تک اس کے وجود کی غرض و غایت معلوم نہ ہو یا معلوم ہو لیکن اس کی تکمیل کو مقصود و مطلوب نہ بنایا جائے تو اس چیز کا وجود عدم کے برابر بلکہ بہت دفعہ عدم سے بھی زیادہ تباہ کن اور خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ فساد تمدن کی تاریخ پر اگر گہری نگاہ ڈالی جائے اور انسانی معاشرہ کے تمام شعبوں کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود واشگاف ہو کر سامنے آجائے گی کہ انسانی جماعات نے اجتماع و تمدن کی غرض و غایت معلوم کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے یا عمداً اس سے بے اعتنائی برتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عالمِ انسانی نے بہت کم ایسے مواقع دیکھے ہیں کہ انسانی معاشرہ اپنی اصلی صورت اور قدرتی مظاہر کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہو اور مظلوم و بیکس انسانیت کو اس کے بے ضرر نتائج و ثمرات سے لطف اندوز ہونے کا شرف ملا ہو۔ چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کی بھاری اکثریت ایسی موجود رہی ہے جس کے گوناگوں خود غرضانہ عزائم نے مختلف راستوں سے تمدنِ انسانی میں رخنے پیدا کیے اور اس کے اجزاء ترکیبی کو الگ الگ کر کے اس کی ہیئت وحدانی کو مسخ کر دیا۔

عقل و دانش اور دین و شریعت کا اقتضا یہ ہے کہ نہ صرف ہر چیز کی

اصلی قدر (ویلیو) کا تعیّن کیا جائے بلکہ اس کی اہمیّت وضرورت کے لحاظ سے اسے انسانی سماج میں موزون جگہ دی جائے اور دوسرے اجزاءِ تمدّن سے اس کی جو نسبت ہے اسے اصلی حالت پر برقرار رکھا جائے - دوسرے الفاظ میں اجزاءِ تمدّن کے باہمی ربط وتسلسل اور تقدّم وتاخر کی نسبت کو قائم رکھا جائے - اور ہر جزو کو وہی جگہ دی جائے جس کا وہ مستحق ہے نہ اسے اپنے اصلی موقف سے گرایا جائے اور نہ اسے اتنا اُچھالا جائے کہ حیاتِ انسانی کے دوسرے ضروری اجزا اس کے نیچے دب کر رہ جائیں کیونکہ اجزاءِ حیات کی بدنظمی اور بے ترتیبی ہی کا دوسرا نام فسادِ تمدّن ہے -

درحقیقت انسان اور انسانی سماج کائناتِ عالم کا ایک اہم شعبہ ہے اور خلّاقِ عالم نے کائنات کے عظیم الشان دائرہ کو ایک ہی مرکز سے وابستہ کردیا ہے - بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا عالم ایک زنجیر ہے اور اس کے ہزاروں لاکھوں شعبے اس زنجیر کی کڑیاں ہیں جو باہم پیوست اور مربوط ہیں - ہر کڑی اپنے مقام پر جڑی ہوئی ہے اور دوسری کڑیوں سے اس کو قرب کی نسبت ہو یا بُعد کی - لیکن وجود و بقا کے اعتبار سے بہرحال ان کی محتاج ہے مثلاً زمین سے اُگنے والا پودا اگرچہ بظاہر اپنا منفرد وجود رکھتا ہے مگر حقیقت میں زمین، کرۂ مائی، کرۂ ہوائی اور فلکیات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا گہرا رشتہ ہے - بلکہ یہ اپنے وجود و بقا میں ان چیزوں کا محتاج ہے -

بالکل اسی طرح انسانی تمدن اور خود انسان اشیاءِ عالم سے بے تعلق نہیں بلکہ انسان کا وجود و بقاء انواعِ کائنات کا متقاضی ہے، بہت سی ایسی

چیزیں ہیں جن میں یہ اپنی خلاقی اور صناعی کے جوہر دکھاتا ہے۔ اور بہت سی ایسی ہیں جن پر اس کے وجود و بقا کا انحصار ہے اور جس چیز کا نام سماج ہے وہ انسانوں کے باہم ملاپ بلکہ انسان اور دیگر انواع کائنات کے باہم تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر انسانی تمدن کو کائناتی مظاہر سے الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے کارخانۂ عالم میں ایک خاص موقف و مقام حاصل ہے۔ مگر انسانی تمدن بھی چونکہ بجائے خود ایک بڑی کثرت پر مشتمل ہے اس لیے اس کی مخصوص ترکیبی حالت سے کسی حال میں اغماض نہیں کیا جاسکتا، اور اس کے اجزائے ترکیبی کی پوری پوری نگہداشت کرنا امنِ عالم کے لئے ازبس لازمی ہے۔ یعنی جس طرح تمدن کی اس نسبت کو قائم رکھنا ضروری ہے جو اسے دیگر انواع کائنات کے توسط سے حاصل ہے۔ اسی طرح خود اس کے اجزاء ترکیبی کی باہم مخصوص نسبت کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے اور اجزاء تمدن کو الگ الگ کردینا یا کچھ اجزاء کو کلی طور پر نظرانداز کردینا ایک باغیانہ حرکت ہے جو انسانی سوسائٹی کو ہلاکت و بربادی کے سمندر میں ڈھکیل دیتی ہے۔

مگر اشیا کی قدریں (ویلیوز) متعین کرنے یا ان کو مناسب اور موزون جگہ پر رکھنے کا کام تنہا عقل انسانی انجام دے سکتی ہے یا اس کے لیے کسی فوق العقل رہنمائی کی ضرورت ہے؟ یہ وہ اہم مسئلہ ہے جس کے حل ہو جانے کے بعد کائناتِ انسانی کی تمام مشکلیں چند لمحوں میں حل ہو سکتی ہیں۔

جہاں تک عقلِ انسانی کا تعلق ہے۔ درحقیقت وہ کسی چیز کے فہم و ادراک کے لیے ایک آلہ تو ضرور ہے مگر چونکہ معصوم عن الخطا نہیں اس لیے اس پر

اتنا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ نوع انسانی کی قسمت کی باگ ڈور اس کے حوالے کر دی جائے۔ اور اس کے ہر فیصلہ کو آخری اور اٹل فیصلہ تصور کر لیا جائے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عقلِ انسانی قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے اور اس کا ہر فیصلہ حکم سابق کی نفی کرتا ہے۔ لہذا عقل کو علوم یقینیہ کا سرچشمہ نہیں مانا جاسکتا بلکہ اس سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ محض تخمین وظن ہے وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ لہذا ظن وتخمین پر جب تمدنِ انسانی کی بنیادیں استوار ہوں گی تو وہ تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور ہوں گی جو موجِ حوادث کے ایک ہی تھپیڑے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائیں گی ع

راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات

درحقیقت تمدنِ انسانی کے موجودہ مفاسد عقلیت محضہ ہی کا نتیجہ ہیں اور جب تک اس کی عمارت الہام ربانی کی مضبوط بنیادوں پر کھڑی نہ کی جائے گی۔ انسانیت کے اصل دکھ کا ہرگز مداوا نہ ہو سکے گا۔ اور انسانی سماج پہلے سے زیادہ خطرات و مہالک سے دوچار ہوتا چلا جائے گا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کا انسان خدائے قدوس کا مدِ مقابل بن کر تمدنی اور معاشی الجھنوں کو اپنے ہی ناخنِ تدبیر سے حل کرنے پر تلا ہوا ہے اور اسے اپنی ذات پر بھروسہ ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن حیاتیاتی مسائل کو حل کر ہی کے دم لے گا۔

هل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً ۞ الذین ضل سعیهم فی الحیٰوة الدنیا وهم یحسبون انهم یحسنون صنعاً (آیہ)

اقوامِ حاضرہ کی ایک بنیادی غلطی | دین و شریعت سے اغماض و انحراف

اور صرف عقل پر بھروسہ کرنے کا ایک مہلک نتیجہ یہ ہے کہ اقوام حاضرہ آج تک انسانی سماج کے مختلف اجزا کے باہم ربط و تسلسل اور ان کے حقیقی توازن و تناسب کے فہم و ادراک سے یکسر قاصر ہیں۔ کسی نے حریت و آزادی اور حکومت و سیاست کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ انسانی زندگی کے ابدی حقائق کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ گویا انسانیت کا مطلوب و مقصود حکومت خود اختیاری اور خود ارادیت ہے۔ اور کسی نے پوری انسانی زندگی کو معاشیات میں گم کر دیا ہے اور تمام دوسرے حیاتیاتی مسائل کو معیشت کے تابع بنا دیا ہے حالانکہ انسانیت کی منزلِ مقصود نہ حکومت و آزادی ہے اور نہ معاشی خوش حالی، بلکہ انسانیت کا نصب العین ایک نہایت معصوم اور مقدس ترین مقصد کی تکمیل ہے ع

مقصدے از آسماں بالا ترے

اس بات پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے کہ انسانی سماج کے تہذیبی، نظری اور عملی پہلوؤں میں گہرا ربط، حیرت انگیز توازن اور پُر اسرار تسلسل پایا جاتا ہے اور تمدنِ انسانی میں فساد و اختلال اس وقت رونما ہوتا ہے جبکہ اسکے بین الاجزائی توازن کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ یعنی کسی غیر ضروری جزو کو ضروری اور ضروری جزو کو غیر ضروری بنا دیا جاتا ہے یا کچھ اجزا کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ اجزا کچھ ایسے ڈھنگ سے باہم مربوط اور ہم آہنگ ہیں کہ کسی ایک جزو کی نفی یا فساد دوسرے اجزا پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد پورا سماج کچھ اس طرح دھیمی رفتار کے ساتھ کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے کہ سطحی نظر

رکھنے والوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مگر ارباب دانش جو حقائق اشیا کو کماحقہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ تمدن انسانی کے پر اسرار مد و جزر کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔

موجودہ سیاسی اور معاشی نظامات میں یہ امر خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے کہ زمانہ حال کے سیاسیین (پالیٹیشنز) اور معاشیین (اکانمسٹس) نے تمدنی اجزا کے قدرتی تناسب اور فطری توازن کو بالکل ضائع کر دیا ہے اور ہر نظام میں اس کے مختلف شعبوں کی اہمیت کو طریق عدل سے نہیں جانچا گیا بلکہ ان لوگوں نے فکری اور عملی شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو اس قدر اُجاگر کر دیا کہ باقی تمام شعبے اس کے آگے مدھم پڑ گئے، یا دوسرے تمام شعبوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

انسانی سماج میں معیشت کا صحیح مقام

دراصل انسان کے حیاتیاتی مسائل میں مسئلۂ معیشت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ انسان کی دماغی اور جسمانی جولانیوں کے لیے صرف یہی ایک میدان رہ گیا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری چیز اس کے لیے باعث کشش نہیں ہے اگر انسانی مقاصد کو صرف تن آسانی اور جسم پروری ہی میں محدود تصور کر لیا جائے تو پھر جنگل کے درندوں اور انسانوں میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے اور پھر ایسے انسانوں کے متعلق کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ یہ جانوروں کا ایک انبوہِ عظیم ہے، جو ہوسِ نفس کی تکمیل کے سوا کوئی اعلیٰ مقصد نہیں رکھتا اور

اس لحاظ سے کہ انھوں نے جوہرِ انسانیت کو چند ذلیل اور گھٹیا درجہ کی مادّی خواہشات میں گم کردیا ہے ۔ وہ " بل ھم اضل " کے خدائی فیصلہ کے بجا طور پر مستحق ہیں اور ان کا یہ رجحانِ عمل انتہائی درجہ کی ضلالت ہے ۔ کیونکہ انھوں نے اپنے مقام و موقف کو قطعی طور پر فراموش کردیا ہے اور انسانیت کے لباس میں انھوں نے درندوں کی سی خواہشات کو اپنا مطمحِ نظر بنالیا ہے ۔

اُولٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ (آیہ)

یہ تسلیم ہے کہ انسان کو شخصی اور اجتماعی فرائض کی ادائی میں ہر لحظہ معاشی سوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے ان میں یہ مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ معیشت کے فساد سے فقر و فاقہ کی پریشانی ، انتشارِ طبیعت اور دماغی کوفت بلکہ صدہا دوسری بلائیں انسان کے دل و دماغ میں گھر کرلیتی ہیں اور افرادِ جماعت میں خود غرضانہ تصادم شروع ہوجاتا ہے جس سے حکومت کے نظم و نسق پر تباہ کن اثر پڑتا ہے ، بلکہ نظری اور تہذیبی شعبوں سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور اس طرح پورا انسانی تمدن خطرات و مہالک کی نذر ہوجاتا ہے ۔ چنانچہ آج تک نظام ہائے ملوکیت و استبداد میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے ۔ مطلق العنان امرا و ملوک اپنے بیش بہا فاخرانہ لباس ، تخت و تاج کی جلوہ آرائیوں ، سر بفلک عمارات ، لہو و لعب اور کھیل کود کے شیطانی آلات ، قیمتی گھوڑوں کی نمائش اور دیگر خواہشاتِ نفسانیہ کی تکمیل کی خاطر لاکھوں روپے خرچ کر ڈالتے اور ان اخراجات کو پورا کرنے کی غرض سے وہ باشندگانِ ملک پر گراں قدر ٹیکس عائد

کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے سوا ان کی تعیش پسندیاں درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تھیں اور بالآخر افرادِ رعیّت کی حالت گدھوں کی سی ہو جاتی جو صرف بوجھ لادنے کے کام آتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی حکام کی عیش پسندیوں کی نذر کر دیتے۔ اور اس طرح وہ پریشان کن فاقہ میں مبتلا ہو کر شخصی اور اجتماعی فرائض اور ذکر و فکر کی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ امام ولی اللہ صاحب گذشتہ شاہان و ملوک اور ان کی رعایا کی حالت بیان کرتے ہوئے سلطنتِ مغلیہ کے اعضا و ارکان کی تعیش پسندانہ حالت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

وما تراہ من ملوك بلادك يغنيك عن حكايا تهم (حجۃ اللہ البالغہ ص۸۳)	اپنے ملک کے ملوک و امرا کی حالت دیکھنے کے بعد ان شاہانِ ماضی کے حالات بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہ تو نظامِ ملوکیت کا حال ہے۔ مگر موجودہ جمہوری نظام (ڈیموکریسی) نے نظری اصول و مبادی سے قطعِ نظر اگر اس کی عملی حیثیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ اپنی تمام نمائشوں اور بعید از کار دعاوی کے باوجود بری طرح ناکام رہی ہے۔ بلکہ اگر اس کے ظاہری خوشنما پردوں کو اٹھا دیا جائے تو اس کی تہہ میں قیصریت و استبداد ہی کی روح کارفرما نظر آئے گی۔

اس کی وجہ جیسے کہ پہلے بیان کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اقوامِ حاضرہ نے انسانی مسائل کو عمومی اور ہمہ گیر نقطۂ نظر، لازمانی اور دوامی زاویۂ نگاہ اور کلیاتی طرزِ فکر سے سوچنے اور حل کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ بلکہ انھوں نے ہمیشہ جزئیاتی

اور وقتی مصالح اور عارضی مفادات کو پیش نظر رکھا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے معیشی سیاست (اکنامک پالیٹکس) کو حیاتِ انسانی کے دوسرے اہم شعبوں سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ حالانکہ جس طرح معیشت دوسرے شعبہائے حیات پر اثر انداز ہوتی ہے اسی طرح انسانی زندگی کے ذہنی، تہذیبی اور معاشرتی زاویے معیشت پر اثر ڈالتے ہیں، بلکہ اخلاقی اقدار (مارل ویلیوز) تمدن کے تمام اجزا میں گہرا اور پائدار اثر رکھتے ہیں۔ اور اس دوگونہ اثر و تاثر سے سیاستِ عادلہ معیشت صالحہ اور تمدنِ صالح کی تخلیق ہوتی ہے۔ امام ولی اللہؒ نے اس حقیقت کو ذیل کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

ذالک بان یتراٴس قوم یغلب علیھم الآراء الجزئیۃ دوا لمصالح الکلیۃ فیخرجون الی اعمال سبعیۃ کقطع الطریق و الغصب او اکساب ضارۃ کالربا و تطفیف الکیل والوزن۔

(حجۃ اللہ البالغہ ص۳)

یہ اس لیے کہ ان پر ایسے لوگ غالب آجاتے ہیں جن کے ذہن و فکر پر آرا جزئیہ (وقتی اور عارضی مصلحتیں) غالب آجاتی ہیں اور مصالح کلیہ (ہمہ گیر الہیاتی نظریئے) کو ترک کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ درندوں جیسے اعمال پر اُتر آتے ہیں۔ مثلاً ڈاکہ زنی غصب حقوق، سود اور کم تولنا اور کم ناپنا وغیرہ۔

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے معاشیاتی پہلو کو نظر انداز کرنا جس قدر خطرناک ہے اس سے بہت زیادہ تمدن کے ذہنی اور مابعد الطبیعی اجزا سے اغماض کرنا مہلک ہے اور معیشت کا صحیح مقام یہی ہے کہ اس کی اہمیت کے احساس کے باوصف اسے مقصود بالذات نہ تصوّر کیا جائے۔ بلکہ انسانیت

کے اصل مقصد کے لیے اسے ایک وسیلہ قرار دیا جائے یعنی معاشی سیاست کو ہمہ گیر الہیاتی تصورات کے تحت رکھا جائے کہ اس کے سوا کسی حال میں ایک عادلانہ نظام معیشت معرض وجود میں نہیں آ سکتا۔

حکومت اسلامی کی سیاستِ مالیہ کے بنیادی عنصر

اس میں شک نہیں کہ آج دنیا کی جمہوری اور قومی حکومتوں (نیشنل سٹیٹس) نے اس بنیادی نظریہ کو قبول کر لیا ہے کہ حکومت کی سیاست مالیہ (فنانشل پالیٹیکس) کی بنیاد مصالح عمومی، عدل وانصاف اور مساواتِ عامہ پر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بنیادی دستور وآئین (کانسٹی ٹیوشن) میں ان بنیادی حقوق کو نمایاں جگہ دی ہے۔ اگرچہ ان کے دساتیر باطلہ کی یہ دفعات آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکیں، اور نہ ہی آئندہ اس کی امید ہو سکتی ہے۔ اسلام نے متذکرہ بالا حقوقِ انسانی کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی بنیاد ایک مقدس الہیاتی تصور پر رکھی ہے یعنی حکومتِ اسلامی کی سیاستِ مالیہ میں یہ دفعات ایک مذہبی اور روحانی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ شعبۂ مال (فنانشل ڈیپارٹمنٹ) کے تمام کارکن ایک مقدس جذبہ کے تحت اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور افرادِ رعیت حکومت کو جو ٹیکس ادا کرتے ہیں اس میں صرف یہی مقصد نہیں ہوتا کہ وہ تمتع حقوق کا معاوضہ ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کے علاوہ تزکیۂ وتطہیرِ قلب بھی ان کے پیشِ نظر رہا کرتی ہے

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (آیہ)

آپ ان سے صدقہ لیجیئے کہ ان کا مال پاک اور ستھرا ہو جائے۔

حبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

ظاہر ہے کہ جس مملکت میں اربابِ حکومت اور افرادِ رعیت ایک ہی پاکیزہ جذبہ کے تحت باہم تعاون کر رہے ہوں کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے ایک خوشحال اور ترقی یافتہ ملک نہ بن جائے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی شاہد ہے کہ بنو امیّہ کے قابلِ احترام خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کے ڈھائی سالہ دورِ خلافت میں ملک کی معاشی حالت میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہوگیا تھا، یعنی جہاں لاکھوں کی تعداد میں غربت زدہ اور مفلوک الحال لوگ تھے اس مختصر عرصہ میں کوئی ایک شخص بھی محتاج نظر نہ آتا تھا۔

دراصل بات یہ ہے کہ کوئی ایسا آئین تیار کر لینا جو خوبصورت اور مرعوب کن الفاظ کا مرقّع ہو۔ کچھ مشکل نہیں مگر اس کو نافذ العمل کرنے کے لیے جس پاکیزہ اور بے غرض ماحول کی ضرورت ہے وہ صرف کسی ایسے قانون کے ذریعہ معرضِ وجود میں آسکتا ہے جو اپنی طبعی قوت سے انسانوں کی اغراضِ فاسدہ کی اصلاح کر سکتا ہو۔ اگر غور کیا جائے تو یہ قوت صرف اسلام کے قانونِ معیشت ہی میں آپ کو مل سکے گی۔ چنانچہ اسلام نے انفرادی اور اجتماعی معیشت کی اصلاح کے لیے ایک ایسا جامع اور مکمل قانون پیش کیا ہے کہ اس سے وہ تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں جن سے انسانی خود غرضیوں کو تمدنِ انسانی میں گھسنے کا موقع مل سکتا ہے۔

فسادِ معیشت کے عوامل چنانچہ جن اسباب و عوامل کی وجہ سے

معیشت انسانی میں اختلال و فساد رونما ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک خود غرضانہ مسابقت (کمپی ٹیشن) کا مکروہ جذبہ ہے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں ایک بنیادی اصول پیش کر دیا ہے کہ زمین اور زمین کی ہر چیز خدا کی ملکیت ہے اور انسان صرف متصرف ہے۔ اس بنا پر جو شخص جائز اور آئینی طور پر کسی چیز پر قابض ہو جائے وہی اس چیز کا جائز حق دار متصور ہوگا اور کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس چیز پر قبضہ کرنے یا ناجائز طریق سے اس چیز کو ہتھیانے کی کوشش کرے۔

من احییٰ ارضاً میتۃً فھی لہٗ (رواہ غیر واحد من المحدثین)

بلکہ خرید و فروخت میں ایک دوسرے سے مسابقت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

ولا تلقوا الرکبان للبیع ولا یبیع بعضکم علیٰ بعض ولا یسم الرجل علیٰ سوم اخیہ ولا تناجشوا ولا یبیع حاضر لباد۔

آبادی سے نکل کر باہر کے تاجروں کو راستہ ہی میں نہ پکڑو۔ دوسرے شخص کی بیع میں مداخلت نہ کرو۔ اور کوئی شخص اپنے بھائی کی بولی پر بولی نہ دے اور محض دوسروں کو خریداری سے روکنے کے لیے بولی نہ بڑھاؤ۔ اور کوئی شہری دیہاتی کی طرف سے خرید و فروخت نہ کرے۔

یہاں تک کہ اپنے مال کا عیب چھپانے اور مصنوعی طور پر اس کو خوبصورت بنانے سے منع کر دیا گیا ہے۔

مَن غشّ فلیس منی۔ — جو دھوکا کرے گا وہ میری ملت سے باہر ہے۔

فسادِ معیشت کا دوسرا سبب دولت کی نامنصفانہ تقسیم اور نامساوات ہے۔ اسلام نے جیسا کہ کسی دوسری جگہ مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔ تمام افراد رعیت

کو نظام تمدن میں برابر کا شریک قرار دیا ہے۔

فسادِ تمدن و معیشت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اربابِ حکومت اور افرادِ رعیت میں باہم تعاون نہ ہو۔ مگر اسلامی فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) کی بنیاد ہی تمام افرادِ جماعت کے باہم تعاون پر ہے۔

نیز کچھ ایسے وسائلِ معیشت ہیں جو اپنی طبیعت کے اعتبار سے تمدنِ انسانی کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً سودی کاروبار، قمار بازی، سٹہ بازی وغیرہ۔ چنانچہ اسلام نے نہایت سختی کے ساتھ ایسے ذرائعِ معیشت کو ممنوع قرار دیا ہے۔ بلکہ ہر ایسی خرید و فروخت جس میں سود کا معمولی سے معمولی شائبہ موجود ہو، ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے۔

ترکت تسعۃ اعشار الحلال مخافۃ الربا   میں نے سود کے خوف سے حلال کے نو حصے بھی چھوڑ دیے ہیں۔

اسی بنا پر بیع مزابنہ، بیع ملامسہ، بیع منابذہ، بیع محاقلہ اور بیع حصاۃ وغیرہ اقسامِ بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اور تمام ایسے معاملات جن میں نزاع و اختلاف کا خدشہ ہو۔ مثلاً غیر حاضر چیز کی بیع اور ایسی بیع جس میں عوضین (قیمت اور مال) میں سے کوئی ایک مجہول اور غیر متعین ہو ناجائز قرار دیے ہیں۔

اسی طرح ایسے ذرائعِ کسبِ مال جن میں کثیر نفع اندوزی کا امکان ہو۔ جیسے احتکار اور اکتناز کی سخت ممانعت کر دی گئی ہے۔ گذشتہ صفحات میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

حکومتِ اسلامی کی سیاستِ مالیہ

حکومتِ اسلامی کا شعبۂ مال (فنانشل ڈیپارٹمنٹ) ایک ایسے جامع اور ہمہ گیر مالیاتی نظام کا حامل ہے جو نہ صرف حکومت کے تمام شعبوں کے نظم و نسق کو ہر قسم کے اقتصادی ضعف و انتشار سے محفوظ رکھتا ہے، بلکہ ملک کے تمام باشندوں کی خوشحالی اور فارغ البالی کا بھی ضامن ہے۔ آئندہ سطور میں آپ یہ معلوم کر سکیں گے کہ حکومتِ اسلامی کے ذرائع آمد اور مصارف میں کچھ اس طرح کا حیرت انگیز طریقِ اعتدال ملحوظ رکھا گیا ہے کہ تمام حکومتی شعبے مثلاً دفاع (ڈیفنس)، تعلیم (ایجوکیشن)، رفاہِ عامہ (پبلک ورکس) صنعت و حرفت (انڈسٹری)، تجارت (کامرس)، عام رعایا کے غربت زدہ افراد کی امداد و اعانت اور مصیبت زدہ علاقوں کے ریلیف کے کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں اور اتنے عظیم الشان اور بھاری موازنہ (بجٹ) کو ایسے طریق پر صرف کیا جاتا ہے کہ تمام اجتماعی اور ملکی ضروریات کی تکمیل کے بعد بھی خزانہ ملی (بیت المال) میں کسی قسم کے خسارہ کا امکان نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ اسلامی نظام معیشت ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت اور رنگ و نسل ملک کے ہر باشندہ کی کفالت کرتا ہے۔ اور مملکتِ اسلامی میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو فقر و فاقہ میں مبتلا ہو اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے وسیع اخراجات کے باوجود حکومت

کا خزانہ کسی دوسرے ملک کا زیر بار نہیں ہوتا۔

خزانۂ ملی کے ذرائع آمد[1]

خزانۂ ملی (بیت المال) کی آمدنی کے تین مستقل ذریعے ہیں۔(۱) خمس غنائم (۲) جزیہ و خراج (۳) صدقات، یہ بیت المال کے الگ الگ فنڈز ہیں۔ اور اسلامی نظامِ اقتصاد کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ ان تینوں مدات کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان میں سے ہر شعبہ کی نوعیت جداگانہ ہے۔ کارکن اور ملازم الگ الگ ہیں اور مصارف جُدا جُدا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مورد اوّل! خمس الغنائم

عساکرِ کفر پر جنگ کے ذریعے غلبہ و تسلّط حاصل کرنے کے بعد جو مال و متاع اور اسلحہ مسلمانوں کے قبضہ میں آتا ہے اسے "غنیمت" کہا جاتا ہے۔ امام ابویوسف نے معادن اور رکاز کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ رکاز سے مراد وہ سونا اور

---

[1] اس باب کا بیشتر حصّہ امام ابو یوسف کی مشہور و معروف کتاب (کتاب الخراج) سے ماخوذ ہے۔ علاّمہ خضری مصری کی کتاب تاریخ الامم الاسلام اس وقت میرے سامنے ہے، جس میں علاّمہ موصوف نے کتاب الخراج کا ایک معتد بہ حصّہ نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتب حدیث، و سیر اور کتب فقہ اور کتب تاریخ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور اس میں کچھ تشریحی اضافے بھی شامل ہیں۔ صدیقی

چاندی ہے جو پیدائشی طور پر زمین میں موجود ہو۔ نیز کنوز عادیہ (جو کسی شخص واحد کی ملکیت نہ ہوں) اور سمندر سے جواہرات و عنبر کی قسم کی جو چیزیں برآمد ہوتی ہیں اسی حکم میں شامل ہیں۔

اس مال کے پانچ حصّے کیے جاتے ہیں۔ چار حصّے غانمین یعنی ان مجاہدین میں تقسیم ہوتے ہیں جن کی جانبازانہ جد و جہد سے یہ اقتدار حاصل ہوا ہے اور اس میں اہل الدیوان یعنی وہ سپاہی جو باقاعدہ طور پر حکومتِ اسلامی سے تنخواہ پاتے ہیں اور متطوعین یعنی وہ لوگ جو صرف اجر و ثواب کی خاطر جہاد میں شرکت کرتے ہیں سب مساویانہ طور پر حصّہ دار ہوں گے۔ اس تقسیم میں سوار کے لیے دو حصّے اور پیدل کے لیے ایک حصّہ مقرر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہی ہے۔ لیکن ان کے شاگرد امام ابو یوسف کے نزدیک سوار کو تین حصّے اور پیدل کو ایک حصّہ ملے گا۔ مگر امام ابو یوسف نے امام المسلمین کو اختیار دیا ہے کہ جو مسلک پسند آئے اس پر عمل کر سکتا ہے۔

مصارفِ خمس اموالِ غنائم کے چار حصّوں کی تقسیم کے بعد پانچواں حصّہ امام یا بالفاظِ دیگر خزانۂ ملّی کے لیے مخصوص ہے اور زمانۂ رسالت میں اس کے جو مصارف تھے ان کی تفصیل یہ ہے:

ایک حصّہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے جو غلبہ اقتدار کے لیے اصل منبع ہیں، ایک حصّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا یعنی بنو ہاشم اور بنو المطلب کے لیے ہے کہ یہ لوگ جاہلیت و اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیتے رہے ہیں اور فتح و نصرت میں ابتدا سے آپ کے شریک کار رہے ہیں۔ اور باقی تین

حصے یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ خود کمانے سے عاجز ہیں اور ان کا باقی رکھنا حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ سورۂ انفال میں یہی اصولِ تقسیم بیان ہوا ہے:

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ۔	جو غنیمت کا مال تمھیں حاصل ہوا اس میں کا پانچواں حصہ خدا و رسول کے لیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

مگر یہ طریقِ تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک ہی جاری رہا۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے دورِ خلافت میں "الرسول" اور ذوی القربیٰ کے دو حصے ساقط ہوگئے ہیں بلکہ حضرت علی کے عہد میں بھی شیخین ہی کا طریقہ رائج رہا۔

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اتفاق کیا ہے کہ رسولِ خدا صلعم اور ذوی القربیٰ کے دو حصے اسلحہ، جنگ اور دیگر سامان میں خرچ کیے جائیں۔ امام اعظم کا مسلک یہی ہے۔ البتہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلعم کا حصہ مصالح المسلمین میں صرف ہونا چاہیئے اور ذوی القربیٰ کا حصہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کو دیا جائے۔ اور ان کے اغنیا و فقراء میں مساوات ملحوظ رکھی جائے۔ کیونکہ ان کے نزدیک استحقاق کی اصل وجہ قرابت نسبی ہے جو امراء و غرباء میں برابر ہے۔ البتہ یہ لوگ لینے سے انکار کریں تو اس صورت میں یہ حصہ اسلحۂ جنگ میں صرف کیا جائے۔ امام اعظم

خلفاء راشدین کے طرز عمل اور صحابہ کے اجماع پر عمل کرتے ہیں اور خمس کو صرف تین مصارف میں تقسیم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں یعنی یتامیٰ، مساکین اور مسافر، ذوی القربیٰ کے غربا بھی ان ہی میں شامل ہیں بلکہ ان کو سب سے مقدّم رکھا گیا ہے۔ مگر ان میں کے اغنیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس کے حقدار نہیں رہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک استحقاق کی وجہ قرب نسبی نہیں بلکہ قرب نصرت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے مخصوص تھی۔ اس سلسلہ میں ذیل کی مستند حدیث، استدلال کے طور پر پیش کرتے ہیں:

عن جبیر ابن مطعم قال لما قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سھم ذوی القربیٰ من خیبر بابین بنی ھاشم و بنی المطلب جئت انا و عثمان فقلنا یا رسول اللہ ھولاء بنو ھاشم لا ننکر فضلھم لمکانک منھم اخواننا من بنی المطلب اعطیتھم و ترکتنا وانما نحن وھم منک بمنزلۃ واحدۃ فقال انھم لم یفارقوا فی جاھلیۃ ولا اسلام وانما بنو ھاشم و بنو المطلب شیٔ واحد۔ (اخرجہ ابوداؤد فی الخراج وابن ماجہ فی الجہاد والنسائی فی قسم الفئ)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر کے مال سے ذوی القربیٰ کا حصہ تقسیم کیا تو میں اور عثمان حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا بنو ہاشم کی فضیلت کے تو ہم منکر نہیں ہیں کیونکہ آپ ان میں سے ہیں۔ لیکن بنو المطلب اور ہم آپ سے ایک ہی نسبت رکھتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے ان کو دیا ہے اور ہم کو چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا وہ جاہلیت اور اسلام میں کسی وقت بھی ہم سے جدا نہیں ہوئے۔ اور بنو ہاشم اور بنو المطلب دونوں شئے واحد کا حکم رکھتے ہیں۔

اسی نوعیت کی ایک دوسری آمدنی ہے۔ جسے اسلامی اصطلاح میں

"فے" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "فے" سے مراد وہ نقدی مال یا زمین یا سامان ہے جو مسلمانوں کو بغیر جنگ و قتال کے صرف شوکت و ہیبت کے ذریعہ حاصل ہو چونکہ اس کے حصول میں مجاہدین اسلام کو کسی قسم کی محنت و مشقت نہیں اٹھانی پڑتی، اس لئے اس میں اُن کے لیے کوئی حصّہ نہیں اور یہ پوری آمدنی بیت المال میں داخل کی جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے اس اصل کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۔	اللہ تعالیٰ جو مال بغیر جنگ کے اپنے رسول کو عطا کرے وہ صرف خدا و رسول ذی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے ہے ۔

موردِ ثانی - جزیہ و خراج

جزیہ اور خراج بیت المال کی مستقل آمدنی ہے۔ اور یہاں لوگوں سے وصول کیے جاتے ہیں جو مقابلہ و دفاع کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب ہو جائیں۔ ان کے دیار و امصار مسلمانوں کے قبضہ میں آ جائیں اور یہ لوگ، حکومتِ اسلامی کے ماتحت رہنا منظور کر لیں۔ ان لوگوں کو اہل الذمہ یا ذمّی کہا جاتا ہے، چونکہ ان لوگوں کی جان و مال کی حفاظت حکومت اسلامی کے ذمّے ہوتی ہے۔ اس لیے حکومتِ اسلامی ان سے ایک معمولی ٹیکس وصول کرتی ہے اور شرعی اصطلاح میں اس ٹیکس کو "جزیہ" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ٹیکس کی مقدار اعلےٰ درجے کے امرا سے ۱۲ روپے، متوسط درجے کے لوگوں سے ۶ روپے اور عام پیشہ ور لوگوں سے ۳ روپے سالانہ ہے۔ مگر اس ٹیکس سے عورتیں، بچّے

اپاہج، اندھے، ضعیف العمر، غلام، درویش اور مذہبی رہنما مستثنےٰ ہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے جو کسی وجہ سے بیکار ہو گئے ہوں، اور ان کے ہم مذہب لوگ انھیں صدقہ و خیرات کے مستحق تصور کرتے ہوں۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ ان کو حکومتی ٹیکس معاف کر دیا جاتا ہے بلکہ ان کی تمام معاشی ضرورتوں کی حکومت متکفل ہوتی ہے، یعنی بیت المال ان کی ضروریات پوری کرتا ہے۔

متذکرہ بالا قسم کے لوگوں کے علاوہ بھی کچھ اشخاص کو جزیہ سے مستثنےٰ کیا جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص اپنی ملت سے الگ حکومتِ اسلامی کو اپنی امداد و اعانت کا یقین دلائے اُسے جزیہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ طبری نے ۲۲ھ کے واقعات و حوادث میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ عبدالرحمان ابن ہبیر نے جو حضرت عمرؓ کے جرنیل تھے۔ جب آذربائیجان فتح کیا تو اس ملک کے پادشاہ سے اس قسم کا معاہدہ کیا اور حضرت عمرؓ نے بھی اِسے پسند کیا۔

جزیہ کی متذکرہ مقدار تو ایک عام قانونی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر امام کو یہ بھی اختیار ہے کہ اس سے بھی کم مقدار پر اہل الذمہ سے سمجھوتہ کرلے۔ اس صورت میں جزیہ کی مقدار جانبین کی طے شدہ مقدار سے کسی حال میں کم و بیش نہ ہو سکے گی۔

لان الموجب هو التراضی فلا یجوز التعدی الی غیر ما وقع علیه الاتفاق (ہدایہ)	چونکہ اس مقدار کا موجب باہم رضامندی ہے۔ اس لیے اس سے تجاوز کرنا جائز نہ ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران سے اسی قسم کا معاہدہ کیا تھا۔

مفتوح اقوام کی زمینوں کے سلسلہ میں امام المسلمین کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان کو مسلمانوں میں تقسیم کر دے یا اصل مالکوں کے قبضہ میں رہنے دے جیسے فتح خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف زمین مسلمانوں میں تقسیم کر دی تھی اور باقی نصف کو عوام کے لیے وقف کر دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قانون کے لحاظ سے اگرچہ دونوں صورتیں جائز ہیں مگر مسلمانوں نے بالعموم دوسری صورت کو ترجیح دی ہے۔ یعنی زمین اصل مالکوں کے پاس ہی رہنے دی گئی۔ اور ان کے مالکانہ قبضہ کو بدستور بحال رکھا گیا، البتہ اہل خیبر سے خاص حالات کی بنا پر پہلا طریقہ برتا گیا۔

مسلمانوں نے جب عراق اور شام فتح کیا تو صحابہ کرام میں سے بعض اصحاب رائے نے یہ مطالبہ کیا کہ دیگر اموال و امتعہ کی طرح زمین بھی فاتحین میں تقسیم کی جائے۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس کی مخالفت کی۔ اور استدلال میں یہ آیت پیش کی

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ
سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ ۔ (آیہ)

اس آیت کے حکم کے مطابق یہ مال انصار و مہاجرین اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے قرار پایا ہے۔ اور اگر زمین بھی غانمین میں تقسیم کر دی گئی تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔ حضرت عمرؓ کے اس استدلال نے سب کو خاموش کر دیا۔ اور زمینیں اصل مالکوں کے

قبضے میں رہنے دی گئی۔ اور ان پر خراج کی ایک مقدار مقرر کر دی گئی۔

امام ابو یوسف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس قسم کی زمینوں کے سلسلہ میں امام کو اختیار ہے کہ وہ یہ زمینیں غانمین میں تقسیم کر دے یا کسی مصلحت کی وجہ سے اصل مالکوں کے قبضے میں رہنے دے اور ان سے خراج وصول کرے۔ یہی خراجی زمین ہوگی اور ایک دفعہ جب زمین خراجی بن گئی تو وہ ہمیشہ خراجی ہی رہے گی۔ اب امام کو اختیار نہ ہوگا کہ اسے ذمیوں کے قبضہ سے نکال کر کسی دوسرے کے حوالے کر دے۔ بلکہ یہ زمینیں اہل الذمہ کی ملکیت ہونگی اور ان کی خرید و فروخت کا ان کو پورا حق ہوگا۔ اور ان میں وراثت کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ امام صرف ان سے خراج وصول کرنے کا مجاز ہوگا۔ اب ارض خراجی کی تعریف یہ ہوگی۔

اہل عجم کی وہ زمین جس پر مسلمان جنگ کے ذریعہ غالب آئیں۔ اور امام اسکو غانمین میں تقسیم نہ کرے بلکہ اصل مالکوں ہی کے قبضے میں رہنے دے یا ان لوگوں سے مصالحت کے بعد ان کو ذمی قرار دے۔ اس تعریف سے مندرجہ ذیل انواع زمین خارج متصور ہوں گے۔

(۱) بنی تغلب کے سوا اہل عرب کی زمین (۲) اہل عجم جو رضا و رغبت سے اسلام قبول کر لیں (۳) اہل عجم کی وہ زمین کہ مسلمان جنگ کے ذریعے اس پر غالب آئیں اور امام اس زمین کو غانمین میں تقسیم کر دے۔ زمین کی یہ تینوں قسمیں عشری کہلائیں گی اور ان سے حکومت اسلامی عشر وصول کرے گی۔

جو زمین ایک دفعہ خراجی قرار پائے گی وہ ہمیشہ خراجی ہی رہے گی یہاں تک کہ اگر مسلمان بھی اسے خرید لے تو اسے خراج ہی دینا پڑے گا۔ چنانچہ حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے خراجی زمینیں خریدی تھیں اور ان کو خراج ہی دینا پڑتا تھا۔

خراج کی مقدار انواع پیداوار کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے خراجی زمینوں پر ذیل کے تناسب سے خراج مقرر کیا۔

جریب الشعیر۔ یعنی جو کی فصل سے فی جریب۔ دو درہم (آٹھ آنہ)

انگور اور کھجور سے فی جریب ـــــ دس درہم (ڈھائی روپے) اور دوسری روایت میں آٹھ درہم (دو روپے)

سبزی کی جریب سے تین درہم (بارہ آنے)

گیہوں کی جریب سے چار درہم (ایک روپیہ)

کنجد اور روئی سے بحساب فی جریب پانچ درہم (ایک روپیہ چار آنے)

اور گنے کی فصل سے فی جریب چھ درہم (ڈیڑھ روپیہ)

امام ابو یوسف کے نزدیک ان مقادیر کی پابندی لازم نہیں بلکہ جمہور الناس علیہ کے مصالح کے پیش نظر امراء خلفا اس میں رد و بدل کر سکتے ہیں نیز خراج کی وصولی میں کسی مخصوص پیمانہ اور مخصوص سکہ کی تخصیص امام موصوف کے نزدیک بیت المال اور اہل خراج دونوں کے لیے ضرر رساں ہے۔

ارض موات جو ممالک جنگ یا صلح سے فتح ہوں اور ان میں کچھ زمین ایسی ہو کہ اس میں اب تک کھیتی نہ کی گئی ہو اور نہ ہی

اس پر کوئی عمارت تعمیر کی گئی ہو۔ نیز کسی بستی کے مرافق میں شامل نہ ہو، تو یہ ارض میتہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح ارض حرب کی کوئی قوم اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں چلی جائے اور ان کی زمین معطل رہ جائے اور اس پر کسی معلوم شخص کی ملک متحقق نہ ہو تو یہ زمین بھی ارض میتہ کہلائے گی۔ ایسی زمین کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے دے دے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس زمین کو اجارہ پر دے دیا جائے اور اس کی آمدنی بیت المال کی ملکیت متصور ہو اور اگر امام کی اجازت سے کوئی دوسرا شخص اس زمین کا احیا کرے تو وہی مالک تصور کیا جائے گا۔

من احیٰی ارضاً میتۃً فھی لہٗ (اخرجہ الترمذی والنسائی وکثیر من المحدثین ورواہ البخاری بلفظٍ آخر)

یہ زمین اگر عشری زمین میں واقع ہو تو عشری اور اگر خراجی زمین میں واقع ہو تو خراجی متصور ہو گی۔

القطائع قطعیہ وہ زمین ہے جو امام کی طرف سے ان لوگوں کو ملتی ہے جو کسی خاص وصف یا خدمات ملی میں ممتاز ہوں۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے جاگیر کہا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو، یعنی اس کا کوئی مالک معلوم نہ ہو۔ یہ زمین بہر حال عشری ہو گی۔

خراج کی وصولی میں کامل احتیاط

کسی گذشتہ بحث میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے ذمیوں کے حقوق کو پورا کرنے کی سخت

تاکید کی ہے۔ امام ابو یوسف نے بھی ذمیوں کے حقوق پر تبصرہ کیا ہے اور اس ضمن میں مندرجہ ذیل حدیث درج کی ہے :

و روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من ظلم معاھداً او کلفہ فوق طاقتہ فانا حجیجہ۔	جو شخص معاہد ذمی پر ظلم کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس کو تکلیف دیگا قیامت کو میں اس کے آگے رکاوٹ بنوں گا، یعنی وہ نعماء جنت سے محروم ہوگا۔

اس بنا پر امام ابو یوسف نے اس محکمہ کے عمال و ملازمین کے تقرر کے سلسلہ میں بہت سی احتیاطی تدابیر اور بیش قیمت ہدایات بیان کر دی ہیں جن پر عمل کرنے سے کسی ذمی سے ناانصافی یا اس کی حق تلفی کا معمولی سے معمولی خدشہ بھی باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں :

اہل خراج سے خراج کے علاوہ اور کسی قسم کی اُجرت نہ لی جائے۔ نیز عامل کی میزبانی یا اس کے سواری کے جانور کے چارہ کا بوجھ اس پر ہرگز نہ ڈالا جائے۔ اسی طرح تولنے والوں کی مزدوری ان سے وصول نہ کی جائے۔

اس غرض کے لیئے جو عامل مقرر کیا جائے اس میں ذیل کی صفات موجود ہوں :

فقیہہ اور عالم ہونے کے علاوہ اہل الرائے سے مشورہ لینے والا ہو۔ پاکباز ہو۔ اللہ کی راہ میں کسی کی ملامت سے خائف ہونے والا نہ ہو۔ حقوقِ انسانی کا محافظ اور امانت دار ہو۔ موت کے بعد کی عقوبت سے ہر وقت ڈرنے والا ہو، اور تنفیذ احکام میں کسی طرح کے ظلم کا اس سے

کوئی خطرہ نہ ہو، بلکہ وہ ایسی نرمی سے برتاؤ کرنے والا ہو جس میں کچھ سختی کی آمیزش ہو۔ مگر سختی ایسی نہ ہو کہ ظلم کی حد تک پہنچ جائے۔ اہل صلاح یعنی نیک اور صالح لوگوں سے نرمی کا سلوک کرے اور اہلِ معصیت پر سختی کرے اور ذمیوں کے حقوق کی پوری نگرانی کرے۔ مظلوم سے انصاف کرے اور ظالم کو دبائے اور عوام سے عفو و کرم کے ساتھ پیش آئے۔

ان امور کی رعایت کے علاوہ خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ ایسے نیک اور صالح اشخاص کو عمّال کی نگرانی کے لیے مقرر کیا جائے جن کی دینداری اور دیانت داری پر بھروسا کیا جاتا ہو۔ یہ لوگ عمّال کی سیرت اور ان کے اعمال کی چھان بین کریں کہ وہ ذمیوں سے کس طرح کا سلوک کرتے ہیں جب ان لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی عامل خراج کی رقم سے زیادہ وصول کرتا ہے تو اس کو سخت سزا دلائے کہ آئندہ ایسی حرکت کرنے کی کبھی اُسے جرأت نہ ہو۔

عشور۔ محصول

عشور کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے، حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ ٹیکس مقرر کیا گیا، جبکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ہمارے تاجر ارضِ حرب میں جاتے ہیں تو ان سے محصول (ٹریڈنگ ٹیکس) وصول کیا جاتا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے تحریر فرمایا کہ تم بھی ان کے تاجروں سے یہ ٹیکس وصول کیا کرو۔ نیز مدینہ منورہ میں باہر کے تاجروں سے محصول لیا جاتا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس کی مقدار نصف کر دی تھی تاکہ مال کی درآمد میں اضافہ ہو۔

عن عبد اللہ ابن عمرؓ ان عمرؓ ابن الخطاب کان یاخذ من النبط من الحنطة والزیت نصف العشر یرید بذالک ان یکثر الحمل الی المدینة

(موطا امام مالک)

عمرؓ نبطیوں سے گیہوں اور روغن زیتون کا محصول بیسواں حصّہ لیا کرتے تھے تاکہ مدینہ میں مال کی درآمد زیادہ ہو۔

یہ ٹیکس اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی لیا جاتا تھا یعنی مال کا دسواں حصّہ باہر کے تاجروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ نے اس ٹیکس کو برقرار رکھا۔ مگر بعض اجناس میں بقدر نصف تخفیف کردی تھی۔

کان ذالک یوخذ منھم فی الجاھلیة فالزمھم ذالک عمر

(موطا امام مالک)

زمانۂ جاہلیت میں مال کی درآمد پر دسواں حصّہ لیا جاتا تھا اور حضرت عمر نے اس کو برقرار رکھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے:

ذمیوں سے دسواں یا بیسواں حصّہ۔ اور مسلمانوں سے ہر چالیس درہم میں ایک درہم اور دوسو درہم سے کم میں کسی قسم کا محصول نہیں۔ اس مد میں اہل الذمہ سے جو کچھ لیا جاتا ہے وہ خراج میں داخل ہے اور مسلمانوں سے جو کچھ لیا جاتا ہے وہ صدقات میں۔ لہذا جس شخص نے یہ محصول ادا کردیا ہو، اور وہ قسم کھا کر کہہ دے کہ میں نے اس مال کی زکوٰۃ دے دی ہے۔ تو وہ قسم میں سچا مانا جائے گا۔

اس محکمہ کے لیے بھی امام ابو یوسف نے سفارش کی ہے کہ دیندار اور صالح اشخاص کو چنگی خانوں پر عامل مقرر کیا جائے، جو لوگوں پر کسی طرح کا ظلم نہ کریں۔ اور معین رقم سے زائد وصول نہ کریں۔ نیز ان لوگوں کی نگرانی کے لیے ہر دلعزیز اور صالح اشخاص کو نگراں (انسپکٹر) مقرر کیا جائے کہ وہ ان لوگوں کے اعمال کا جائزہ لیں۔

خراج کے تقرر میں احتیاط

خراج کے تقرر میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زمین مقررہ خراج کو برداشت کر سکتی ہے؟ اگر برداشت نہ کر سکتی ہو تو امام کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مقدار کم کر دے۔ اور اگر زمین کی مقدار اتنی ہے کہ خراج کی مقررہ مقدار سے زائد کو بھی برداشت کر سکتی ہے تو اس صورت میں مقررہ خراج ہی بحال رکھا جائے اور اس کو بڑھانے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حذیفہ اور ابن حنیف سے دریافت کیا۔

لعلکما حملتما الارض مالا تطیق	شاید تم نے زمین پر اتنا زیادہ خراج لگایا
فقالا لا بل حملناها ما تطیق ولو	ہو جس کو زمین برداشت نہیں کرتی۔
زدناها لاطاقت۔ (ہدایہ)	دونوں نے کہا کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اتنا لگان لگایا ہے جس کو زمین برداشت کر سکتی ہے اور اگر ہم اس سے بڑھا دیں تو بھی برداشت کر سکتی ہے۔

نیز پانی کی قلت یا سیلاب کی وجہ سے اگر فصل تباہ ہو جائے تو خراج نہ لیا جائے گا۔

وان غلب علی ارض الخراج الماءُ — خراجی زمین سیلاب کی نذر ہوجائے یا پانی
او انقطع الماء عنہا او اصطلم الزرع — منقطع ہوجائے یا کھیتی پر کوئی آفت نازل
آفۃ فلا خراج علیہ (ہدایہ) — ہوجائے تو اس پر خراج نہیں ہے۔

مصارفِ خراج خراج کی آمدنی مصالح عامّہ پر صرف ہوتی ہے مگر مصالح وضروریات کا انتخاب و ترجیح امام کی رائے سے متعلّق ہے اور وہی وقتی حالات کے پیشِ نظر کسی ایک یا چند مصارف کو دوسرے مصارف پر ترجیح دے سکتا ہے۔

عہد نبوی میں خراج کی سب سے بڑی آمدنی یعنی ایک لاکھ روپیہ بحرین سے آئی تھی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ صبح کے بعد سب کی سب تقسیم فرما دی۔

فما قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وثم منہا درہم (بخاری) — یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے اس وقت تک نہ اٹھے جب تک کہ آخری درہم بھی لوگوں کو نہ دے دیا۔

زمانۂ رسالت میں آمدنی محدود تھی اور ہر مسلمان اسلامی فوج کا سپاہی تھا اور ان کے مراتب متعین نہ تھے۔ صرف غنائم کے حصص اربعہ اور اراضی خیبر کے خراج ہی سے ان کی مدد کی جاتی تھی۔ جب حضرت صدیق اکبر خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے بھی اسی طریق مساوات کو قائم رکھا۔ کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جن لوگوں کی خدمات اسلامی زمانہ میں ان کو دوسروں کے برابر رکھا گیا ہے مگر خلیفۂ اوّل نے جواب دیا۔ کہ

خدمات کا صلہ خدا دے گا اور یہ دنیاوی معیشت ہے۔ اس میں ترجیح و امتیاز کی ضرورت نہیں۔

فھذہ معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ۔ (کتاب الخراج)	یہ معیشت ہے اور اس میں مساوات، ترجیح و امتیاز سے بہتر ہے۔

لیکن جب حضرت عمر خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے ایک باقاعدہ نظام کے تحت مسلمانوں کے مدارج و مراتب مقرر کر دئے اور اس نظام کو تمام قلمرو میں وسیع بنا دیا۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کے معذور اور محتاج لوگوں کی بھی باقاعدہ تنخواہیں مقرر فرما دیں۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا:

واللہ الذی لا الٰہ الا ھو ما احد الا ولہٗ فی ھذا المال حق اعطیہ او منعہٗ وما احد احق بہ من احد الا عبدٌ مملوك وما انا فیہ الا کاحدکم۔ (کتاب الخراج)	اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں اس مال میں ہر ایک کا حق ہے، خواہ اسے دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ عبد مملوک سے زیادہ کوئی بھی اس کا حق دار نہیں اور میرا حق بھی تم میں سے کسی ایک سے زیادہ نہیں۔

چنانچہ انھوں نے خدمات اسلامی، سبقت فی الاسلام، غنا فی الاسلام اور حاجت فی الاسلام کی بنا پر مراتب کا تعین کیا۔ اور حسب مراتب وظائف مقرر کیے۔ امرا جیوش اور شہروں کے حکام کی گرانقدر تنخواہیں مقرر کر دی گئیں اور ان عطیات کا باقاعدہ رجسٹر بنا دیا گیا جس میں علےٰ حسب المراتب

لوگوں کے نام درج تھے۔ قضاۃ کی تنخواہیں بھی اسی فنڈ سے دی جاتی تھیں یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ لیکن مدنیت کی ترقی کی وجہ سے جب لوگوں کی ضرورتیں بڑھ گئیں، اور وہ مختلف قسم کے صنائع و اشغال اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تو ان عطیات میں کمی کر دی گئی، صرف وہی لوگ اس زمرہ میں رہ گئے جو باقاعدہ اسلامی فوج میں شامل تھے اور امت کی حفاظت کے لیے جن کی شدید ضرورت تھی۔

خراج کی آمدنی متذکرہ صدر ضرورتوں کے علاوہ ان نہروں کی اصلاح و تعمیر کے لیے صرف ہوتی ہے، جن سے عام پبلک فائدہ اٹھاتی ہے۔ نیز مسافر خانوں، پلوں کی تعمیر اور رفاہ عامہ (پبلک ورکس) کے دوسرے امور پر بھی صرف ہوتی ہے۔

جزیہ کے مصارف بھی بالکل یہی ہیں۔ چنانچہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

کان الجزیۃ فی عمارۃ القناطیر و الجسور و سد الثغور و کری الانھار العظام التی لا ملک لاحد فیھا کجیحون والفرات والی ارزاق القضاۃ والمحتسبین و المعلمین والمقاتلۃ وحفظۃ الطریق من اللصوص۔ (فتح القدیر صـــ۳۵۶)	جزیہ بھی ان مصارف میں صرف کیا جاتا ہے، یعنی پلوں کی تعمیر، سرحدی چھاؤنیوں کے استحکام، بڑی نہروں کے کرایہ میں جو کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ جیسے جیحون اور فرات نیز قضاۃ محتسبین، معلمین مجاہدین اور ڈاکوؤں سے راستہ کی حفاظت کرنے والوں کے وظائف میں خرچ کیا جاتا ہے۔

النوائب نوائب سے مراد ہنگامی ٹیکس ہیں، جو خاص حالات کی وجہ سے رعایا پر عائد کیے جاتے ہیں ۔ صاحب ہدایہ نے النوائب کی یہ تعریف کی ہے:

مایتوبه من غیر راتب (رباب الکفار) وہ مطالبۂ زر جو دائم اور مسلسل نہ ہو۔

اس قسم کے ٹیکس ہر حکومت اپنی رعایا پر عائد کرتی ہے ۔ بالخصوص اس وقت جب کہ خزانۂ ملکی ملک کی ضروریات کا متحمل نہ ہو سکتا ہو، یا حکومت کو اجتماعی اور ملکی کاموں کے لیے کوئی خاص ضرورت لاحق ہو جائے ۔ اسلام میں بھی خاص حالات میں اس کی اجازت ہے ۔ مگر اس بات کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے کہ یہ نائد ٹیکس اتنا زیادہ نہ ہو کہ ظلم کی حد تک پہنچ جائے ۔ نیز کسی خاص اہم ضرورت کے بغیر اس کی اجازت نہیں ۔ اسلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس قسم کے ٹیکس ادا کرنے والوں کو دوسرے تمام ٹیکس معاف کر دیے جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ جزیہ اور خراج سے بھی وہ بری الذمہ ہو جاتے ہیں ۔

موردِ ثالث ۔ الصّدقات آج دنیا کے ممالک میں سرمایہ و دولت کی جس قدر بہتات ہے، شاید اس سے قبل کبھی نہ دیکھی گئی ہو ۔ صنعتی اور تجارتی اداروں کا وسیع جال روئے زمین پر پھیلا ہُوا ہے اور موجودہ حکومتیں معاشیاتی اور اقتصادی تگ و دو میں ایک دوسری سے سبقت لے جانا چاہتی ہیں ۔ مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ آج دولت اور سامانِ عشرت کی جس قدر فراوانی ہے اسی قدر دنیا کے

پس ماندہ طبقے عسر و افلاس اور فاقہ و تنگ دستی کے ہاتھوں مضمحل اور پریشان ہیں۔ اس کی وجہ دولت کی نامنصفانہ تقسیم ہے یعنی دولت کو اس ڈھنگ سے پھیلایا گیا ہے کہ وہ پھر پھرا کر اعلیٰ طبقوں کے خزانوں میں آ پہنچتی ہے اور مزدور و کارکن طبقے انتہائی مشقت اٹھانے کے باوجود نانِ شبینہ کے محتاج ہیں کیونکہ ان کے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے سرمایہ دار طبقے کام لے رہے ہیں۔ دولت کی اس نامساوات ہی نے عالمِ انسانی کو پریشان کر رکھا ہے اور اسی سے طبقۂ عمال میں ایک شدید انتقامی جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔

اسلام نے روزِ اول ہی سے تقسیم و مساوات کے اہم ترین مسئلہ کو پیشِ نظر رکھا، اور اس غرض کے لیے ایسے قوانین بنا دیے کہ کسی کے پاس دولت کے انبار جمع نہ ہو سکیں۔ اور اگر کوئی شخص اپنی ذاتی قابلیت سے کچھ سرمایہ جمع کر لے تو وہ صرف اس کی ذات تک ہی محدود نہ رہے بلکہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر غربا کے پاس پہنچتا رہے۔ چنانچہ اسلام نے اس مقصد کے لیے امراء و اغنیاء پر زکوٰۃ، عشر اور دیگر مختلف قسم کے مطالبات عائد کر دیے ہیں، اور اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ کہ:

تؤخذ من اغنیائھم و ترد الی فقرائھم۔ (صحاح)	یہ صدقات قوم کے امرا سے لے کر فقراء میں تقسیم کر دیئے جائیں۔

تاکہ اسلامی سوسائٹی میں کوئی شخص حد سے زیادہ امیر نہ بن سکے اور نہ ہی کوئی حد سے زیادہ غریب اور افلاس زدہ ہو بلکہ ایک طرح کی مساویانہ حالت پیدا ہو جائے۔

صدقات کی کئی قسمیں : (۱) نقود یعنی سونے اور چاندی سے۔ (۲) اموالِ تجارت سے (۳) چارپایوں سے (۴) زمینوں سے۔ پہلی تین قسموں پر زکوٰۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور آخری قسم کو عشر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور "الصّدقات" دونوں کو حاوی ہے۔ ان اقسام کے مقادیر اور دیگر تفاصیل کتبِ فقہ میں بالتفصیل مل سکتی ہیں۔

مصارفِ صدقات

غربا و مساکین کی امداد و اعانت کے مختلف طریقے ہر مذہب و ملّت میں رائج ہیں لیکن اسلام نے منظّم اور باقاعدہ طور پر اس شعبہ کا اہتمام کیا ہے۔ اور اسلام میں یہ مسئلہ انفرادیت سے نکل کر ایک اجتماعی اور ملّی مسئلہ بن گیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں ذیل کی آیت اصل کا حکم رکھتی ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ (توبہ)

صدقات، فقراء اور مساکین کے لیے ہیں؛ اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کی وصولی پر متعین ہیں اور جن کے دلوں میں دینِ حق کی محبت پیدا کرنا مقصود ہے، اور غلاموں کو آزاد کرنے، مقروض لوگوں کا قرض اُتارنے، جہاد فی سبیل اللہ اور مسافروں کے لیے ہیں۔

اس آیت میں تمام انفرادی اور ملّی ضروریات کو ہشت گانہ اقسام میں منضبط کر دیا گیا ہے۔ اور ان آٹھ مصارف کو ایسی ترتیب سے ذکر کیا ہے کہ اس سے حکمتِ الٰہی کے بے شمار اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے۔

فقراء و مساکین

سب سے پہلے فقراء و مساکین کے دو گروہ ذکر کیے گئے ہیں۔ کیونکہ صدقات سے مقصود بالذات انہی لوگوں کی حاجت مندی اور فقر و فاقہ کو دور کرنا ہے، مگر اہلِ احتیاج درجاتِ احتیاج کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اس بنا پر ان کو فقراء اور مساکین دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ فقراء وہ لوگ ہیں جو اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے اور ہر شخص ان کو محتاج کی حیثیت سے جانتا اور پہچانتا ہے۔ مگر مساکین کی کیفیت دوسری ہوتی ہے، یعنی ان کو محتاج کی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ بلکہ ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر بہتوں کو ان کے مالدار ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے جسم پر اب تک اجلے کپڑے اور ان کے گھر میں کچھ نہ کچھ اثاث البیت موجود ہے، لیکن کاروبار نہ ملنے یا کسی دوسری وجہ سے ان کی اندرونی حالت سخت ناگفتہ بہ ہوتی ہے، یہاں تک کہ بروقت امداد نہ ملنے پر کپڑے اور اثاثۂ بیت کو بیچ کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نیز فقیر وہ شخص ہے جو سوال کرنے میں عار نہیں سمجھتا، لیکن مسکین سوال کرنے سے ہچکچاتا ہے اور اس کی خودداری اور عزت النفس اسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے روکتی ہے۔ چنانچہ مسکین کی یہی تعریف خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس المسکین الذی تردہ	مسکین وہ نہیں جو ایک کھجور اور دو کھجوریں یا ایک لقمہ اور دو لقموں کے لیے

التمرۃ والتمرتان او اللقمۃ واللقمتان ۔ مارا مارا پھرتا رہے۔ بلکہ مسکین وہ
انما المسکین الذی یتعفف ۔ ہے جو سوال سے احتراز کرتا ہے۔

(رواہ البخاری)

دراصل مسکین اُس شخص کو کہتے ہیں جو اندرونی یا بیرونی موانع کی وجہ سے کسب معاش سے عاجز ہو یعنی اس میں کسب و محنت کی قوتیں اب تک نشو و نما نہیں پا سکیں۔ جیسے یتامیٰ یا یہ قوتیں تکمیل کے بعد مضمحل ہو گئی ہیں جیسے ضعیف العمر اشخاص، یا اس میں قوتیں موجود ہیں، مگر ان کو بروئے کار لانے کے ذرائع اسے میسّر نہیں اور اس وجہ سے یہ قوتیں گویا ساکن ہو چکی ہیں۔
چنانچہ صاحب بیضاوی نے مسکین کے یہی معنی بیان کیے ہیں؛

المسکین من السکون کان العجز اسکنہٗ ۔ مسکین کا لفظ سکون سے لیا گیا ہے گویا عجز نے اس کی قوتوں کو ساکن کر دیا ہے۔

العاملین چونکہ فقرا و مساکین کی امداد کا مسئلہ اسلام میں اجتماعی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اجتماعی نظام عمّال اور کارکن قوتوں کے سوا کسی صورت میں نہیں چل سکتا۔ اس بنا پر تیسرے نمبر میں "والعاملین علیھا" کو رکھا گیا۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ ایک اجتماعی فریضہ ہے اور اس کو ادا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ امام کی طرف سے بھیجے ہوئے تحصیلداروں (کلکٹروں) کے حوالے کی جائے۔ اور موجودہ زمانہ میں جس طرح زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے دوسراسر غیر اسلامی ہے۔

جصاص نے "خذ من اموالھم صدقۃً تطھرھم" کے تحت لکھا ہے:

یدل علی ان اخذ الصدقات الی الامام و انہ متی اداھا من وجبت علیہ المساکین لم یجزہ لان حق الامام قائم فی اخذھا فلا سبیل الی اسقاطہ ۔ (احکام القرآن جصاص)	یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صدقات لینے کا حق امام کو ہے اور اگر کوئی صاحب نصاب براہِ راست مساکین کو دے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ کیونکہ امام کا حق بدستور قائم ہے اور اس کے اسقاط کے لیے کوئی وجہ نہیں ۔

یہ عذر اس کے لیے کافی نہیں کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی اجتماعی نظام موجود نہیں۔کیونکہ ایسے نظام کے عدم قیام کے ذمّہ دار بھی تو آخر مسلمان ہی ہیں۔ ان کو کس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ ہر جگہ ایسا نظام قائم کریں اور ایک امیر کے ماتحت بیت المال بنائیں ۔ کوئی حکومت مسلمانوں کے خصوصی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی ۔ اگر مسلمان چاہیں تو ہندوستان کے ہر حصّے میں اپنے بیت المال قائم کر سکتے ہیں۔ اور ایک مستقل نظام کے تحت ملّت کے غربا و مساکین کی امداد و اعانت کا انتظام کیا جا سکتا ہے ۔ مگر اب تو ملک کے ایک بڑے حصّے میں مسلمان آزاد ہو چکا ہے اور ان کی حکومت بھی بن چکی ہے ۔ اب اس نظام کے قیام و انصرام کے لیے کوئی فرضی بہانہ بھی نہیں پیش کیا جا سکتا ۔ ضرورت ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور ملک میں مساواتِ عامّہ کو بروئے کار لانے کے لیے اسلام کے مقدس معاشیاتی نظام سے استفادہ کیا جائے ۔

مؤلفۃ القلوب

ہر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اسلام کے محاسنِ ذاتی سے کم و بیش متاثر ہوتے ہیں۔ اگر مسلمان اپنے اخلاق و سیرت اور مروّت و احسان سے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیں تو وہ بآسانی حلقۂ اسلام میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو "المولفۃ قلوبہم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چونکہ اہمیت کے لحاظ سے یہ مصرف بھی کچھ کم نہیں اس لیے اسے چوتھے درجے میں رکھا گیا ہے۔

امام ابو یعلی الفراء جو حنبلی مذہب کے جلیل القدر امام تھے " المؤلفۃ قلوبہم " کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

واما المولفۃ قلوبھم فھم اربعۃ اصنافٍ
صنف تتالف قلوبھم لمعونۃ المسلمین
وصنف تتالف للکف عن المسلمین
وصنف یتالفھم لیرغبھم فی الاسلام
وصنف یتالفھم ترغیباً لقومھم و
عشائرھم فی الاسلام فیجوز ان
یعطی کل واحدٍ من ھذہ الاصناف
من سھم المولفۃ مسلماً کان او
کافراً۔

مؤلفۃ القلوب کی چار قسمیں ہیں:
(۱) ان لوگوں کی اس لیے تالیف کی جائے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔
(۲) مسلمانوں کو ان کے ضرر سے بچانے کی غرض سے ان کی تالیف کی جائے۔
(۳) ان کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا کرنے کے لیے۔
(۴) ان کی قوم یا قبیلہ کو اسلام سے قریب لانے کے لیے۔

پس مؤلفۃ القلوب کے حصّہ میں سے ان سب لوگوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ خواہ یہ لوگ مسلمان ہوں یا کافر۔ غرض امام موصوف کی اس تفسیر کے

مطابق مولفۃ القلوب کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے ۔

موجودہ زمانہ میں کروڑوں اچھوت ، اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی تنگدلانہ اور سفاکانہ ذہنیت سے تنگ آ چکے ہیں ۔ اور ان کی ایک کافی تعداد اسلام کی معاشی اور مجلسی مساوات سے متاثر ہے ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی اخلاقی کشش و جاذبیت نہیں ہے ۔ اس لیے وہ لوگ اسلام میں آنے کی جراُت نہیں کر سکتے ۔

الرقاب اور غارمین

یعنی وہ لوگ جو کسی طرح کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں ۔ یہ بوجھ غیر محسوس اور حکمی ہو ، جیسے غلامی ، یا محسوس اور حقیقی ہو ۔ جیسے قرض ۔ اوّل الذکر گروہ کو " الرقاب " اور دوسرے کو " الغارمین سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ چونکہ یہ دو مصرف موقّت اور عارضی ہیں ۔ اس وجہ سے ان کو پانچویں اور چھٹے درجے میں رکھا گیا ہے ۔

اس سے قبل کسی موقع پر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں سود اور امداد کے تمام ایسے کاروباری ذرائع بند کر دیے گئے ہیں اور اس کی جگہ قرض حسن کے ذریعہ امداد کرنے کی تاکید کی ہے ، اور قرض حسن کے طور پر امداد کرنا صدقہ وخیرات کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے ۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رئیت لیلۃ اسری بی علی باب الجنۃ مکتوب الصدقۃ بعشر امثالھا	رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معراج کی رات کو میں نے جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوا دیکھا ۔ صدقہ کے بدلے میں

والقرض بثمانیة عشر فقلت یا جبریل	دس نیکیاں اور قرض کے عوض میں اٹھارہ
ما بال القرض افضل من الصدقة	نیکیاں ملتی ہیں۔ میں نے جبرئیل سے دریافت
قال لان السائل یسال و عندہ و	کیا کہ قرض صدقہ سے کیوں افضل ہے۔
المستقرض لا یستقرض الا من	جواب دیا کہ صدقہ لینے والا ضرورت کے
حاجة۔ (اخرجہ ابن ماجہ و اخرجہ الطبرانی	سوا بھی سوال کرتا ہے۔ مگر قرض لینے والا
فی الکبیر عن ابی امامة قریباً منہ)	بغیر ضرورت کے کسی سے قرض نہیں مانگتا۔

فی سبیل اللہ اسلامی نظام حکومت میں پس ماندہ طبقات و جماعات کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور بہت تھوڑے عرصہ میں طبقاتِ عامہ میں اس طرح کی معاشی مساوات پیدا ہو جاتی ہے کہ حکومتِ اسلامی کی حدودِ مملکت میں کوئی محتاج باقی نہیں رہتا اور تمام افرادِ رعیّت خوشحال اور فارغ البال ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کا مقدّس عہد اسی شانِ مساوات کا حامل تھا اور حضرت عمر ابن العبدالعزیز کے ڈھائی سالہ زمانۂ خلافت میں رعایا اس قدر خوشحال ہو گئی تھی کہ ملک کے طول و عرض میں غربت کا نام تک باقی نہ رہا تھا۔ چنانچہ مہاجر ابن یزید کا بیان ہے کہ ہم لوگ صدقہ و خیرات تقسیم کرتے تھے۔ لیکن جو لوگ ایک سال صدقہ و خیرات لیتے تھے وہ دوسرے سال تک خود صدقہ دینے لگتے تھے[1]۔

اس بنا پر ضروری تھا کہ اموال زکوٰۃ کا ایک مستقل اور دائمی مصرف متعیّن کر دیا جاتا۔ چنانچہ فی سبیل اللہ اسی نوعیت کا ایک مستقل اور دوامی مصرف

---

[1] ابن سعد

ہے۔ فی سبیل اللہ سے مراد ہر ایسی جد وجہد کے لیے خرچ کرنا ہے جو دین حق کے غلبہ و استیلا کے لیے عمل میں لائی جائے۔ اس میں دفاع (ڈیفنس) اور اس کے لوازم و ملحقات کے علاوہ تبلیغ و اشاعتِ دین اور تعلیمی مراکز کے قیام کی کوششیں شامل ہیں۔ نیز ان لوگوں پر خرچ کرنا جو باقاعدگی کے ساتھ ان کاموں میں حصّہ لیتے ہیں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں بچ سکتا کہ کسب معاش کی جانب توجّہ دے سکیں۔

اَلَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ۔ (بقرہ)	جو اللہ کی راہ میں روک دیے گئے ہیں اور طلب معاش کے لیے کوشش نہیں کر سکتے۔

بعض فقہا نے اس کو اور بھی عام کر دیا ہے۔ اور اس میں مسجد، پل، اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو بھی شامل کر دیا ہے۔

وقیل ان اللفظ عام فلا یجوز قصرہٗ علیٰ نوع خاص ویدخل فیہ جمیع وجوہ الخیر من تکفین الموتیٰ وبناء الجسور والحصون وعمارۃ المساجد وغیر ذالک۔ (نیل الاوطار)	بعض نے کہا ہے کہ لفظ عام ہے اور اس سے کوئی ایک قسم مراد لینا جائز نہیں لہٰذا اس میں تمام نیکی کے امور شامل ہیں مثلاً تکفین موتیٰ، پلوں اور قلعوں اور مساجد کی تعمیر اور اس قسم کے دوسرے امور۔

صاحبِ بیضاوی نے بھی خاص حالات میں قناطیر اور ایسی چیزوں پر خرچ کرنا جائز قرار دیا ہے۔ نیز فقہا، معلّمین اور قضاۃ کو بھی اس مد میں شامل کیا ہے بحسب کہ یہ لوگ غیر مستطیع ہوں۔ مگر یہ اسی وقت جائز ہے جبکہ

طبقاتِ مصرحہ موجود نہ ہوں ۔

ابن السبیل یہ وہ لوگ ہیں جو سفر کی حالت میں اس قدر تنگدست ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے گھر پہنچنا دشوار ہو جائے یہ لوگ اپنے وطن میں اگرچہ مالدار ہوں مگر چونکہ حالتِ سفر میں ان کے پاس کوئی چیز نہیں اس لیے یہ بھی حکماً محتاج ہیں۔ مگر یہ قسم بہت ہی قلیل الوقوع تھی۔ اس لیے اس کو سب سے آخر میں رکھا گیا ہے ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا فنڈ ان تمام اقسام میں تقسیم کرنا ضروری ہے یا ان میں سے جو زیادہ اہم ہوں ان پر ہی خرچ کرنا کافی ہے۔ جمہور علما کا مسلک یہی ہے کہ ان اقسام کا استیعاب ضروری نہیں بلکہ ضرورت و اہمیت کے لحاظ سے ان آٹھ قسموں میں جو زیادہ مستحقِ امداد ہو اس پر خرچ کرنا کافی ہے اور یہ امام کی رائے پر موقوف ہے کیونکہ وہ مصالح وقت کو اچھی طرح جانتا ہے ۔

نیز اس موقع پر اس بات کی تنقیح بھی لازمی ہے کہ حکومتِ اسلامی صدقات کے نام سے جو فنڈ فراہم کرتی ہے وہ صرف متذکرۃ الصدر مصارف ہی میں صرف ہو سکتے ہیں اور اس آمدنی کو دوسری آمدنیوں سے ہرگز نہیں ملانا چاہیئے ۔

لا ینبغی ان یجمع مال الخراج الی مال الصدقات والعشور لان الخراج فیئ جمیع المسلمین والصدقات	خراج کی آمدنی کو صدقات اور عشور سے ملانا نہیں چاہیئے کیونکہ خراج میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں اور صدقات

لمن سمی اللہ عز وجل فی کتابہ۔ — صرف ان آٹھ طبقوں کے لیے ہیں، جو کتاب اللہ میں بیان ہوئے ہیں۔
(کتاب الخراج)

بلکہ خراج اور صدقات کے لیے عامل بھی الگ الگ مقرر کیے جاتے ہیں

ولا یتولاھا عمال الخراج — خراج کے عمال، صدقات کے عامل نہیں بن سکتے۔
(کتاب الخراج)

صدقات کی آمدنی سے کسی غیر مستحق شخص کو ایک حبہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس مال کے استحقاق کی وجہ احتیاج ہے۔

نیز زکوٰۃ جس علاقہ سے فراہم کی جائے، بہتر یہ ہے کہ اسی علاقہ کے غربا پر تقسیم کی جائے۔ چنانچہ حضرت عمران بن حصین کو زکوٰۃ کی فراہمی کے لیے بھیجا گیا۔ جب واپس آئے تو دریافت کیا گیا کہ مال کہاں ہے؟ جواب دیا:

للمال ارسلتمونی اخذناھا من حیث کنا ناخذھا علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووضعناھا حیث کنا نضعھا۔ (سنن بیہقی)

تم نے جمع مال کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے مال لیا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لیا کرتا تھا اور پھر ان لوگوں پر تقسیم کر دیا جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تقسیم کرتا تھا۔

البتہ اگر وہاں کی مقامی ضرورتوں سے مال بچ جائے تو اسے مرکزی بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔

اسلام کے معاشی نظام کی خصوصیت

اسلام کے معاشیاتی نظام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے،

کہ اس میں رعایا پر نہایت معمولی ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ جسے کمزور سے کمزور انسان بھی بآسانی ادا کر سکتا ہے اور پھر اس کے وصول کرنے میں ہر قسم کے ظلم و تعدّی اور جبر و تشدّد سے منع کر دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ جزیہ و خراج کے وصول کرنے میں ان لوگوں کی سہولت کو ہر طرح ملحوظ رکھا جائے چنانچہ سفرِ شام کی واپسی پر حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ لوگ جزیہ ادا نہیں کرتے اس پر آپ نے فرمایا :

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ
قال لا تعذبوا الناس فان الذین	تم لوگوں کو تکلیف نہ دو کیونکہ جو لوگ دنیا میں
یعذبون الناس فی الدنیا یعذبھم	انسانوں پر سختی کریں گے قیامت کو خدا تعالیٰ
اللہ یوم القیامۃ (کتاب الخراج)	ان پر سختی کرے گا۔
عن عمر لا تفتنوا الناس (موطا امام مالک)	لوگوں کو آزمائش میں نہ ڈالو۔

اور پھر اسلام میں اس بات کی خاص رعایت کی جاتی ہے کہ جو فنڈز کسی مقصد کے لیے فراہم کیئے جاتے ہیں وہ تمام تر اسی مقصد پر خرچ کر دیے جاتے ہیں اور ان میں کا ایک حبہ بھی کسی دوسرے مقصد کے لیے صرف نہیں ہوتا۔ خراج اور جزیہ چونکہ جمہور کے مصالح عامّہ کی خاطر وصول کئے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ جیسے لیے جاتے ہیں ویسے ہی عوام کے مصالح میں خرچ کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ جرجی زیدان نے لکھا ہے:

فیعود الی العامۃ کانہ لم یوخذ	رعایا سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ

منهم هي سنة الاسترزاق تظهر
لأول وهلة انها من خصائص
التمدن الاسلامي -

پھر ان کے پاس پہنچ جاتا ہے - گویا ان
سے لیا ہی نہیں گیا - یہ ہے ارتزاق کا عوامی
طریقہ جو تمدن اسلامی کے خصائص کو
واشگاف کرتا ہے -

جدید داعیاتِ معیشت اور ان کا حل

گذشتہ صفحات میں حکومتِ اسلامیہ کے موارد و مصارف (آمد و خرچ) کے سلسلہ میں وہ بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں جو کتاب و سنت اور کتبِ فقہ میں مذکور ہوئے ہیں۔ یہ اصول اپنی جگہ اٹل اور غیر متزلزل ہیں، مگر عصرِ حاضر کی جدید ضرورتوں نے ہمارے لیے فکر و نظر اور استنباطِ جزئیات کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے اور اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم جدید معاشی مقتضیات کا کتاب و سنت کے قوانین کلیہ کی روشنی میں بہتر سے بہتر حل تلاش کریں، کیونکہ اسلام کی ہمہ گیر اور لازمانی حیثیت مسلمانوں کو اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ وہ بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر منضبط کلیات سے جزئیات کا استخراج کریں۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے مقدس دور میں اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ مجلسِ شوریٰ قائم تھی جو امیر المومنین کی موجودگی میں پیش آنے والے جدید مسائل و سوانح کو کتاب و سنت کی روشنی میں حل کرتی تھی۔ مگر اس مجلس آئین ساز (کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی) کا مقصد قانونِ اسلامی کی توضیح و تشریح کے سوا کچھ نہ تھا اور اسے اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ بغیر کسی الہامی سند (اتھارٹی) کے محض عقل کے ذریعہ کسی مسئلہ کا حل تلاش کرے یا کسی غیر اسلامی فکر کو بنیاد قرار دیکر کتاب اللہ کو اس پر

منطبق کرنے کی سعی کرے۔

دورِ حاضر کی بے شمار بوالعجبیوں میں سے ایک بوالعجبی یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل و دماغ پر جدید حیاتیاتی نظریات نے گہرا اثر جما رکھا ہے۔ جب وہ اسلامی مسائل پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں تو ان کی یہ امکانی کوشش ہوتی ہے کہ اسلام کے اصول و نظریات کو توڑ مروڑ کر کسی طرح جدید نظریات سے ان کا رشتہ گانٹھ دیا جائے، اور پھر فخر و تعلی سے اپنے اس اجتہادی کارنامہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ ان لوگوں کی ذہنی مرعوبیت پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے کہ وہ قرآن و حدیث کو تو انسانی نظریوں پر منطبق کرنے کی لاحاصل سعی کرتے ہیں۔ مگر ان کو یہ توفیق میسر نہیں کہ کتاب و سنت کو بنیاد قرار دے کر اس کسوٹی پر غیر اسلامی نظریات کو پرکھیں ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ٭ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی جدید مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے اسلام کی اٹل اور غیر متزلزل صداقتوں اور منضبط کلیات پر اس کی گہری نظر ہو تا کہ جدید سوانح و وقائع کو اسلام کے اصول و آئین پر منطبق کرنے اور جدید قدروں کو فکرِ اسلامی کے معیار پر پرکھنے میں اسے آسانی ہو۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حکومتِ اسلامی کے ذرائع پیداوار (انسٹرومنٹس آف پروڈکشن) جو آج سے کئی صدی قبل کافی ہو سکتے تھے۔ موجودہ بدلے ہوئے حالات اور نئی ضرورتوں کی وجہ سے اب وہ قطعاً ناکافی ہیں۔ موجودہ حکومتوں کے ذرائع پیداوار میں سودی کاروبار، بنکنگ، شراب کی تجارت اور دوسرے

کئی ایسے ذرائع شامل ہیں جن کو اسلامی شریعت نے حرام قرار دیا ہے مگر اب جبکہ کوئی حکومت ان چیزوں کے سوا نہیں چل سکتی، حکومتِ اسلامی کو بھی چاروناچار یہ تلخ لقمہ نگلنا ہی پڑے گا۔

اس سے قطع نظر کہ ان لوگوں کی ذہنی مرعوبیت کس درجہ تک پہنچ چکی ہے اور وہ کون سے مکتبِ خیال کے پیرو ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں ہرگز تامل نہیں کہ یہ لوگ اسلامی فلسفۂ اجتماع کے خصائص طبعی سے نابلد محض ہیں اور ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ اسلام انسانی طبائع میں حیرت انگیز ضبط و نظم (ڈسپلن) ایک جدید طریقِ فکر (وے آف تھاٹ) اور پُراسرار اخلاقی قوّت (مارل پاور) پیدا کرتا ہے اور عالمِ انسانی کو ایک ایسی مقدس سوسائٹی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے کہ موجودہ انسانی سوسائٹی کو اس سے کوئی ادنیٰ نسبت بھی نہیں ہو سکتی اور اسلامی سٹیٹ کو چلانے والے لوگ بھی اسی مقدس سوسائٹی کے ارکان ہوتے ہیں۔ اس لیے اس سٹیٹ کا طرزِ حکومت اور رجحانِ عمل موجودہ حکومتوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

موجودہ مادّہ پرست دنیا کے نزدیک صرف محسوسات و مشاہدات اور ظاہری اسباب ہی پر انسانی زندگی کا انحصار ہے اور کسی فوق الفطرت اور باطنی قوت پر اسے بھروسہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تخیّل کی پرواز ظاہری سلسلۂ اسباب میں جکڑی ہوئی ہے۔ مگر اسلامی سوسائٹی اس عالمِ آب و گِل سے وراء الوریٰ ایک قوّتِ قاہرہ پر ایمان رکھتی ہے اور یہ تصوّر بذاتِ خود ایک بے پناہ طاقت ہے جو اس سوسائٹی میں حیرت انگیز فکری

انقلاب رونما کرتا ہے اور اس کی رفتارِ تخیل کو مادّی حدود و قیود سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب و ماہتاب بھی اس کی بلند پروازی پر رشک کرتے ہیں ؎

وگر قومے کہ ذکرِ لا الٰہ اش   بر آرد از دلِ شب صبح گاہش
نشناسد منزلش را آفتابے   کہ ریگِ کہکشاں روبد ز راہش؛ (اقبالؒ)

یہ ملتِ قیمہ کسی دوسری قوم کی پیروی نہیں کرتی بلکہ اس کا ہر عمل دوسروں کے لیے دلیلِ راہ ہوتا ہے۔

انتم شھداء اللہ فی الارض۔ (بخاری)   تم اللہ کی زمین میں لوگوں کے نگراں اور شاہدِ عدل ہو۔

اور اسے دولت و زر کے خزائن کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کا فقرِ غیور ہی تنہا انفس و آفاق کی تسخیر کے لیے کافی ہے ؎

عرب را حق دلیلِ کارواں کرد   کہ اُو با فقرِ خود را امتحاں کرد
اگر فقرِ تہیدستان غیور است   جہانے را تہ و بالا تواں کرد (اقبالؒ)

یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا وجود علل و اسباب سے وابستہ ہے اور اسلام بھی اس عالمِ اسباب کے ظاہری قوانین سے انکار نہیں کرتا بلکہ اسبابِ ظاہری کے حصول کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ انسان ظاہری اسباب ہی کو موثر بالذّات تصوّر کرے اور اس علۃ العلل سے جو ان ظاہری اسباب میں قوتِ تاثیر پیدا کرتی ہے بالکل اغماض کر لے۔ مردِ مومن ان ظاہری اسباب و علل سے زیادہ اس علۃ العلل پر اعتماد کرتا ہے

جوایک لمحہ میں ان ظاہری اسباب کا رُخ دوسری جانب پلٹ سکتی ہے۔

علماء طبعیات کا فیصلہ ہے بلکہ روز و شب کا مشاہدہ ہے کہ آگ کا کام جلانا ہے۔ اور کوئی جاندار چیز اس کے اندر سے بچ کر نہیں نکل سکتی مگر اس سے آگے وہ نہیں جانتا کہ آگ میں یہ اثر کیسے پیدا ہوا؟ اور کیا کوئی ایسی پراسرار ہستی بھی موجود ہے جو اشیاء کی تاثیروں پر کنٹرول کرتی ہے اور ان میں کمی بیشی یا ان کو بالکل معطل کر سکتی ہے؟ مردِ مومن کو اس بات کا یقین ہے کہ اسباب و علل ایک فوق الفطرت قوّت کے محکوم و تابع ہیں اور وہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز میں اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لیے مومن علّت و معلول اور سبب و مسبب کی بندشوں سے آزاد ہے اور اسباب ظاہری سے زیادہ اسباب باطنی پر بھروسا کرتا ہے ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا　　مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

ممکن ہے کہ ان باتوں کو مذہبی خوش اعتقادی یا شاعرانہ تخیّل سے تعبیر کیا جائے۔ مگر جو لوگ تاریخ اسلامی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہمیشہ مادّی قوّت سے زیادہ روحانی قوّت پر اعتماد کیا ہے اور اس قوت کے ذریعہ وہ بحر و بر پر چھا گئے تھے۔

یہ بات موجودہ عقل پرست انسانوں کے لیے یقیناً تعجب انگیز ہوگی کہ جو چیز دوسری اقوام و ملل کے لیے تقویت کا باعث ہو سکتی ہے وہ ملّتِ اسلامیہ کے ضعف و اضمحلال اور انتشار و تشتّت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ آج دنیا کے ماہرینِ اقتصادیات (اکانمسٹس) اس امر پر متفق ہیں کہ حکومتی

کاروبار کے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ و دولت کی ضرورت ہے اور بجز اس کے کوئی حکومت چل ہی نہیں سکتی - مگر اسلامی نظریہ اجتماع وسیاست کی فطرت ہی الگ ہے کہ یہاں مال و دولت کی بہتات ملّتِ اسلامیہ کے ضعف و انتشار پر منتج ہوتی ہے -

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ بحرین سے مصالحت کے بعد العلاء ابن الحضرمی کو ان پر امیر مقرر فرمایا - ایک مرتبہ آپ نے ابو عبیدہؓ ابن الجراح کو جزیہ وصول کرنے کے لیے بھیجا - جب وہ واپس آئے تو انصار نے خاص اہتمام سے نمازِ صبح میں شرکت کی - آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ شاید تم نے ابو عبیدہ کی واپسی کا حال سُنا ہو گا - عرض کیا ہاں ! فرمایا تمھیں خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے آسانیاں پیدا کر دی ہیں یعنی تم پر رزق کے دروازے کھول دیے ہیں لیکن میں تمھاری غربت سے اتنا خائف نہیں ہوں جتنا کہ تمھاری امارت و تونگری سے مجھے خوف آتا ہے -

فواللہ ما الفقر اخشٰی علیکم و لکنی اخشٰی علیکم ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علیٰ من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا و تلھکم کما الھتکم - (رواہ البخاری)

خدا کی قسم مجھے تمھارے افلاس و فقر کا خطرہ نہیں - البتہ خطرہ اس بات کا ہے کہ تم پر پہلی قوموں کی طرح ہوسِ دنیا نہ چھا جائے اور تم بھی ان کی طرح دنیوی خواہش میں الجھ کر اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہو جاؤ -

حضرت فاروقِ اعظم کے دورِ خلافت میں ایران اور روما کی عظیم الشان

سلطنتوں کے مقابلہ میں یک لخت لشکر روانہ کیے گئے۔ روما کے مقابلہ میں ابوعبیدہ ابن جراح اور خالد ابن الولید کی سرکردگی میں اور ایران کے مقابلہ میں مثنٰی ابن حارثہ اور جریر کی قیادت میں افواج اسلامی نے یلغار کی، عراق کی فتح کے بعد ایک ہزار اونٹ خزائن اور قیمتی ساز و سامان سے لدے ہوئے مدینہ پہنچے۔ یہ سارا مال رات کو مسجد کی چھت پر ڈال دیا گیا۔ صبح کے بعد حضرت عمر نے اس مال کا معائنہ کیا تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس پر عبدالرحمٰن ابن عوف نے عرض کی:

هٰذا من مواقف الشکر فما یبکیک — یہ تو شکر کا مقام ہے، پھر رونے کی وجہ؟

جواب دیا یہ ٹھیک ہے، لیکن

قال اجل ولکن الله لم یعطه قوما الّا القی بینهم العداوة والبغضاء۔ (کتاب الخراج) — یہ دولت خدا نے جس قوم کو دی اس میں بغض و عناد اور انتشار و افتراق پیدا کر دیا۔

اس قسم کے بے شمار تاریخی واقعات ہیں۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر لائقِ اعتماد اللہ کی کتاب ہے، جو اس ساری کائنات میں تنہا علم و یقین کا سرچشمہ ہے۔

قرآنِ حکیم نے بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ دولت و مال کی کثرت مفاسد اجتماعیہ کا سرچشمہ ہے اور گزشتہ قومیں اسی لیے تباہ و برباد ہوئیں کہ ان میں زر پرستی اور عیش پسندی کا مکروہ جذبہ زور پکڑ گیا تھا اور اس نے طریقِ اعتدال سے ان کو منحرف کر دیا تھا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا — ہم نے بہت سی ایسی بستیوں کو ہلاک

فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۔ (قصص) کیا جو معیشت میں حد اعتدال سے بڑھ گئی تھیں ۔ پس یہ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہوئے ہیں ۔

متذکرہ حقائق سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام وسائل معیشت اور پیداواری قوتوں کی تخلیق سے انسانوں کو دور رکھنا چاہتا ہے ۔ بلکہ اسلام میں جو چیز ممنوع ہے وہ دولت کی محبت اور انہماک فی الدنیا ہے جو انسان کو زندگی کے اصل نصب العین سے پھیر دیتا ہے ۔ بہرحال یہ جو کچھ لکھا گیا ہے بحث کا ایک غریب پہلو ہے جس سے آج تک بہت کم لوگ واقف ہیں ۔ اور درحقیقت بجز دلِ درد آشنا اور نظرِ حق شناس کے ان باتوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

اس لیے بہت ممکن ہے کہ اس سے ان لوگوں کو تشفی نہ ہو جن کے قلب و نظر کو دانش فرنگ نے ماؤف کر دیا ہے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ نظر و استدلال سے بھی اس بات کو واشگاف کر دیا جائے کہ سود اور اس قسم کے دوسرے کاروبار سے جو شریعت اسلامیہ میں ممنوع ہیں ملک کی اجتماعی قوتیں بڑھتی نہیں بلکہ کمزور ہوتی ہیں ۔

اسلام نے نہایت شد و مد کے ساتھ سود کی حرمت کا اعلان کیا ہے اور جس وقت ہم اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو کئی ایسے حقائق و مصالح کا انکشاف ہوتا ہے جو حکمت ربانی سے مخصوص ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ سودی کاروبار سے لازماً ملک کے باشندے دو طبقوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ یعنی سودی کاروبار خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی بہر حال اثر و نتیجہ کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں اور اس سے دو مستقل طبقے وجود میں آتے ہیں۔ ایک طبقہ کسی متعین شرح سود پر قرض دینے والا اور دوسرا لینے والا۔ ثانی الذکر طبقہ ملک کے اُن فعال عناصر پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں عرف عام میں مزدور اور کسان کہتے ہیں۔ اور حقیقت میں یہی لوگ مملکت کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں، جن کی اَن تھک کوشش و محنت سے حکومت کا نظام چلتا ہے اور پیداواری قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور اوّل الذکر طبقہ ان عیاش، نکمے اور کاہل الوجود انسانوں پر مشتمل ہوتا ہے جو بیٹھے بٹھائے اپنی عیاریوں اور مختلف وسائل سے دوسروں کے حاصلات محنت پر قبضہ کر لیتے ہیں، یہ لوگ بجز اس کے کہ غریبوں کا خون چوس چوس کر اپنی توندیں بڑھائیں۔ قوم و ملک کے لیے معمولی سے معمولی محنت بھی برداشت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ اور دراصل یہی لوگ قوم کے جسم میں ایک زہریلے اور خطرناک ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کی اندرونی قوتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

بہرحال نظام سود کی یہ فطرت ہے کہ اس سے ملک کا ایک کارآمد اور فعال طبقہ اقتصادی اور جسمانی حیثیت سے تباہ حال ہوتا چلا جاتا ہے اور ملک کی دولت سمٹ کر چند عیاش سرمایہ داروں کی تجوریوں میں پہنچ جاتی ہے اور پھر اجتماعی اور سیاسی نقطۂ نظر سے عوام کی بے چینی اور تباہ حالی سے ریاست بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ عوامی طبقوں پر

جب ہر طرف سے بھوک اور افلاس کا ہجوم ہونے لگتا ہے تو وہ مجبور ہو کر ملک کے سرمایہ دار طبقوں سے متصادم ہو جاتے ہیں اور چونکہ عوامی طبقوں کی ملک میں نمایاں اکثریت ہوتی ہے اور جسمانی لحاظ سے بھی یہ لوگ محنت شعار، دلیر اور نڈر ہوتے ہیں اس لیے ان کی اجتماعی طاقت سٹیٹ اور رائج الوقت نظام حکومت کے لیے مستقل خطرہ بن جاتی ہے، اگر عوامی قوتیں پوری طرح منظم ہو جائیں تو سرمایہ دارانہ نظام کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں ورنہ ملک میں ایک دوامی اور مستقل کشمکش جاری رہتی ہے۔ اور اس طبقاتی جنگ (سیکشنل وار) کے ہوتے ہوئے ملک میں امن و خوشحالی کی ہرگز توقع نہیں ہو سکتی۔

غرض سود کی اجتماعی صورتیں ہوں مثلاً گورنمنٹ بنیکس اور امداد باہمی کی سوسائٹیاں، یا انفرادی سود اور بنیا سسٹم سب میں یہ امر مشترک ہے کہ عوامی طبقوں کے مصائب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسرا فریق خواہ حکومت ہو یا سرمایہ دار بنئے، دولت و زر کے واحد اجارہ دار بن جاتے ہیں اور اس سے ملک میں عام بے چینی اور اضطراب رونما ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ریاست (سٹیٹ) کا سب سے بڑا مقصد ملک کے عوام کی حالت کو بہتر بنانا اور ایک عادلانہ نظام سیاست و اجتماع کے ذریعہ ملک میں امن قائم رکھنا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ملک کے باشندوں میں مساوات کا اصول ملحوظ رکھا جائے اور کسی ایک طبقہ کو دوسروں پر ظالمانہ تسلّط قائم کرنے کے مواقع حاصل نہ ہوں۔ اگر کوئی حکومت اس بنیادی

نظریۂ حکومت سے انحراف کرے گی تو اسے دنیا کی کوئی طاقت فنا و عدم سے محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔

آج جس قدر لوٹ کھسوٹ کے ظالمانہ طریقے رائج ہیں ان کی موجودگی میں ہرگز امن عالم کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے قدرتی طور پر ملک دو متخالف اور متضاد قوتوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے اور اس سے اجتماعی خوشحالی بڑھنے کے بجائے گھٹتی چلی جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ایک مختصر مگر جامع فقرہ میں واضح کر دیا ہے:

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاْ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ۔ تم جو اس غرض سے سود پر قرض دیتے ہو کہ وہ دوسروں کے اموال میں بڑھے یعنی دوسروں کی دولت ساتھ لائے تو وہ اللہ کے نزدیک (حقیقت میں) بڑھتا نہیں بلکہ گھٹتا ہے۔

کل تک دنیا کی تمام قومیں اس بات پر متفق تھیں کہ سود دولت کی پیداوار کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ مگر آج مغرب کے بہت سے بالغ النظر اور سنجیدہ فکر علما نے بھی سود کی قباحتوں کو محسوس کر لیا ہے۔ چنانچہ مسٹر "کول" اپنی کتاب "سوشلزم ان ریوولیوشن" میں لکھتا ہے:

"متعین اور مقررہ شرح سود ملک کے صناع و تجار طبقوں کے لیے سخت خطرناک اور ضرر رساں ہے کیونکہ انھیں بہرحال مقررہ سودی رقم ادا کرنی پڑتی ہے خواہ انھیں اپنے کاروبار میں فائدہ ہو یا نقصان۔ فائدہ کی صورت میں تو ان کے لیے معینہ رقم ادا کرنی آسان ہوتی ہے

مگر صنعت و تجارت میں خسارہ ہونے اور قیمتوں کے گھٹ جانے کی صورت میں سود کی گراں بہار قم ادا کرنا ان کی تباہی کا باعث ہوتی ہے"۔

سود کے علاوہ دوسرے ذرائع آمد جو اسلامی نقطۂ نظر سے حرام ہیں۔ اگر سنجیدگی سے ان کی حقیقت پر بھی غور کیا جائے تو ان سے بھی ملک کی اجتماعی دولت اور فعال قوتوں میں اضافہ کے بجائے نقصان ہی ہوتا ہے۔

اسلام نے ہر حرام چیز کی تجارت کو ممنوع قرار دیا ہے خواہ وہ شراب ہو یا کوئی دوسری چیز۔ لیکن مثال کے طور پر شراب ہی کو لے لیجئے کہ اسلام نے اسے اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ اس سے بے شمار مفاسد و معائب کا دروازہ کھل جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ اجتماع و تمدن کے فساد و اختلال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر کسی حکومت کو یہ مشورہ دینا کہ اسے سودی کاروبار اور دیگر تخریبی تجارتوں کے ذریعہ دولت فراہم کرنی چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں اسے تباہی و بربادی کی دعوت دینا ہے اور اس کے لیے ایسے خیر خواہوں سے بدترین دشمن بہتر ہے۔

موارد مصارف کا توازن

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک لحاظ سے منفی حیثیت رکھتا ہے اور اصل مسئلہ اب تک تشنۂ بحث ہے کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں کیا حکومت اسلامی کے متذکرہ ذرائع آمد کافی ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ حصۂ بحث ہے جو اس باب میں مقصود بالذات ہے۔

چونکہ زندگی کا معیار بالکل بدل چکا ہے اور اجتماعی ضرورتوں میں بھی حیرت انگیز انقلاب آچکا ہے بلکہ نیک و بد کی قدریں بھی تبدیل ہو چکی ہیں۔ اس لیے اب موجودہ فاسقانہ نظام تمدّن و معیشت کے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت ہے کہ اس میں صالح اجزا کون سے ہیں جنھیں باقی رکھا جا سکتا ہے اور فاسد اجزا کون سے ہیں جن کا اخراج لازمی ہے۔ اس عمل تقطیع سے جو اجزا کم ہوں گے اسی تناسب سے داعیاتِ معیشت اور لوازم تمدّن بھی کم ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اس عمل کے اختتام پر ایک معتدل اور صالح نظام تمدّن باقی رہ جائے گا۔ اور پھر اس کی معاشی ضرورتیں بھی خود ہی سمٹ کر حدِ اعتدال پر آجائیں گی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ موجودہ غیر عادلانہ نظام تمدّن میں صرفِ دولت کی سینکڑوں ایسی مدیں ہیں جن کی ایک صالح نظام تمدّن کو ضرورت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ ہی کو لے لیجئے کہ ملک کی آمدنی کا ایک معتدبہ حصّہ ہر سال اس محکمہ کی نذر ہو جاتا ہے اور حکومت کے پروپیگنڈے کے لیے ہزارہا وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ نیز مخالفین کا منہ بند کرنے کے لیے ان کو گراں قدر رشوتیں دی جاتی ہیں۔ مگر ایک عادلانہ نظام تمدّن کو ایسی ضرورتیں لاحق ہی نہیں ہو سکتیں کہ اس کا حسن ذاتی ہی اس کی مقبولیتِ عامّہ کا ضامن ہوتا ہے۔ اس کے محاسن و برکات کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ ملک کے عوامی طبقے جب مطمئن ہوں گے تو وہ خود ہی ایسے نظام حکومت کے تحفظ کو اپنا دینی فرض خیال کریں گے۔ اور بیرونی طاقتوں کے خلاف دفاع و مزاحمت میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اس

صورت میں عوام کو جنگ کے لیے اکسانے اور لالچ دینے کی قطعاً ضرورت نہ ہوگی اور اس طرح ملک کی دولت کا ایک بڑا حصّہ بچ رہے گا۔ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کو محض مثال کے طور پر لیا گیا ہے۔ ورنہ سینکڑوں ایسے مصارف ہیں جن میں ملک کی دولت محض نظام کی خرابی کی وجہ سے صَرف ہوتی ہے۔

اسلام کا نظامِ اجتماع و تمدّن ایک مقدس اور صالح نظام ہے جو اپنے جوہرِ ذاتی کی وجہ سے انسانوں کی ہر جماعت اور ہر طبقہ کو مطمئن کر سکتا ہے اور عقیدہ و نسل کے اختلاف کے باوجود تمام طبقات و جماعات میں حیرت انگیز معاشی اور مجلسی مساوات پیدا کرتا ہے، اس نظام میں کسی ایک فرد یا جماعت کو لوٹ کھسوٹ کی قطعاً اجازت نہیں ہے اور نہ کوئی طبقہ سرمایہ و دولت کے بل پر ملک کے عوام پر ظالمانہ تسلط قائم کر سکتا ہے۔ بلکہ ہر شہری ہر طرح کے مجلسی، معاشی اور سیاسی حقوق سے مساویانہ طور پر بہرہ ور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مملکتِ اسلامی میں کسی ایک فرد کو بھی شکوہ و شکایت کا موقع ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے لیے اسلامی نظامِ تمدّن کی نظری خصوصیات کے علاوہ تاریخِ اسلامی کے کچھ واقعات کی شہادت کافی ہے اور ہم گذشتہ صفحات میں اسلامی نظامِ معیشت کی عملی خصوصیات کے عنوان کے تحت اس مسئلہ پر بحث کر آئے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اسلام کا نظامِ تمدّن اور نظریۂ معیشت موجودہ نظامات سے بالکل مختلف ہے لہٰذا اسلام کے معاشی لائحہ عمل کو کسی دوسرے نظامِ معیشت پر قیاس کرنا ایک اصولی اور بنیادی غلطی ہے اور اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ بات سمجھنے میں بھی کوئی دشواری نہ ہوگی کہ نظامِ اسلامی کو اپنے وجود و بقا

اور نفاذ و اجرا کے لیے جن اشیا کی ضرورت ہے وہ دنیا کے کسی نظام میں دستیاب نہیں ہوسکتیں اور موجودہ نظام تمدن کو جو ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں اسلامی نظام کو ان سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ اسلامی نظام اجتماع و تمدن اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل جدا اور مستقل بالذات ہے۔

یہاں تک یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ فاسقانہ اور غیر عادلانہ سماجی نظام کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ملک کا اجتماعی سرمایہ بہت حد تک بچ رہے گا۔ اور حکومت کو ناجائز ذرائع پیداوار کی ضرورت نہ ہوگی لیکن اس کے علاوہ اسلام جائز ذرائع پیداوار کے اخذ و اختیار سے روکتا نہیں بلکہ حکومت کے دائرہ عمل کی توسیع کے ساتھ ساتھ ذرائع پیداوار میں توسیع کی جاسکتی ہے اور اس غرض کے لیے سینکڑوں طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں صنعت و حرفت (انڈسٹری) دولت کی پیداوار کا بہترین ذریعہ ہے اور ہر حکومت کے لئے بہت آسان ہے کہ وہ ملک کے ہر حصہ میں صنعتی مراکز (انڈسٹریل سنٹرز) جاری کرے۔ نیز کسی ملک کی اقتصادی خوشحالی میں اس ملک کی پیداوار اجناس کو بہت بڑا دخل ہے۔ اس لیے یہ بھی حکومت کا کام ہے کہ زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے جدید سائنٹیفک طریقے ملک میں رائج کرے اور اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ زراعتی محکمہ (اگریکلچرل ڈیپارٹمنٹ) قائم کرے جو ملک کے ہر حصہ میں زمین کی مخصوص صلاحیتوں کی چھان بین کرے اور جس حصۂ زمین میں جو چیزیں پیدا ہوسکتی ہیں وہاں صرف ان چیزوں ہی کی کاشت ہو۔ اور اس کے علاوہ

نئے تجرباتی طریقے استعمال کرنے میں زارعین کی امداد واعانت کرے۔
نیز موجودہ دور میں ٹرانسپورٹ کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے کہ اس کی آمدنی اجتماعی مصارف میں صرف کرے۔ غرض ملک کی پیداواری قوتوں کو بڑھانے کے لیے بہت سے وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ اور خاص حالات میں ہنگامی ٹیکس (نوائب) کی گنجائش بھی ہے۔ کیونکہ وقتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہر حکومت کو حق حاصل ہے کہ وہ رعایا سے زائد ٹیکس وصول کرے اور اسلام بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ نیز دوسرے ممالک سے تبادلہ اجناس اور درآمد مال پر ٹیکس عائد کرنا ہر سلطنت کے لیے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔
امتناعِ سود کی وجہ سے موجودہ طرز کے نظام تجارت پر یقیناً اثر پڑے گا کیونکہ اس سے بینکس اور انشورنس کمپنیز ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ اثر اسلامی سوسائٹی پر نہیں بلکہ موجودہ فاسد سوسائٹی پر پڑ سکتا ہے۔ نیز حکومت اسلامی کے مرکزی بیت المال کی جو شاخیں ملک کے طول و عرض میں قائم ہوں گی ان سے موجودہ بینکس کی نسبت بہتر طریقے پر کام لیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ بیت المال فنڈز سے قرض حسنہ، اجارہ و مضاربت اور دوسرے اسلامی طریقوں سے اہلِ حاجت کی امداد کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک کسان کے پاس بیج خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو بیت المال سے اس کی امداد کی جا سکتی ہے۔ اس کی حیثیت تقاوی کی ہو گی مگر اس میں سود نہ ہو گا۔

ان یدفع للعاجز کفایۃ من بیت المال قرضاً لیعمل فیہ (فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۶۴)
حاجت مند شخص کو بیت المال سے قرض کے طور پر اتنا دیا جائے کہ وہ کام چلا سکے۔

ظاہر ہے کہ موجودہ بنک سسٹم جلب زر کا ایک نہایت خطرناک طریقہ ہے جس کے ذریعے غربا کی دولت کھچ کر سرمایہ داروں کے خزانوں میں جا پہنچتی ہے مگر اسلامی بیت المال ایک مشترکہ سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مقصد صرف مصالح عامہ کی تکمیل ہے۔

موجودہ جاگیردارانہ نظام کی اصلاح

جاگیر کا ایک محدود تصور اسلامی روایات میں بھی ملتا ہے۔
چنانچہ کتب اسلامی میں اس کے لیے "القطیعہ" کی اصطلاح مستعمل ہے اور علماء سلف نے اس کی یہ تعریف کی ہے:

ما یمنحہ الامام من الارض لبعض الممتازین بفعالھم من الرعیۃ	قطعیہ وہ زمین ہے جو امام عادل کی طرف سے بعض ممتاز لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔

امام ابویوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح عراق کے بعد کسریٰ اور اس کے خاندان اور ان لوگوں کی زمینیں جو جنگ میں مارے گئے تھے یا ارض حرب کو چلے گئے تھے، جاگیر کے طور پر ان مجاہدین کو عطا کیں جو خدمات اسلامی میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

امام موصوف اس کے بعد رقمطراز ہیں کہ خلیفہ عادل کے لیے جائز ہے کہ ایسی زمین جو کسی کی ملکیت نہ ہو اور نہ ہی کسی وارث کے قبضہ میں ہو، کسی ایسے شخص کو قطعیہ کے طور پر دے دے جو اسلام میں خاص مرتبہ رکھتا ہو اور یہ زمین اس کے قبضہ میں رہنے سے مملکت اسلامی کو اقتصادی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ نیز امام عادل کو اختیار ہے کہ ایسی زمین کو عُشری قرار دے

یا خراجی ۔

متذکرہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ کسی کو جاگیر عطا کرنا امام عادل کا کام ہے اور امام عادل کے سوا دوسرے لوگوں کی دی ہوئی جاگیریں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ خویش پروری اور احباب نوازی کی کمینہ اور ذلیل خواہشات سے مبرّا نہیں ہوتے اور نہ ہی ان سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ محض استحقاق اور خدماتِ ملّی کا لحاظ کریں گے ۔

امراء بنی امیہ نے اپنے ایامِ حکومت میں غیر مسلموں کی زمینیں شاہی خاندان میں جاگیر کے طور پر تقسیم کر دی تھیں۔ مگر جب انہی میں سے امام عادل محبوبِ ملّت حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ایسی تمام زمینیں شاہی خاندان کے لوگوں سے چھین کر اصل مالکوں کے حوالے کر دیں ۔

اس بنا پر موجودہ نظامِ جاگیرداری سراسر فاسد اور غیر عادلانہ ہے۔ کیونکہ ان میں سے بلیشتر جاگیریں خدماتِ کفر کے صلہ میں حاصل کی گئی ہیں اس لیے کسی اسلامی ریاست میں ان کو ہرگز باقی نہیں رہنا چاہیئے ۔

موجودہ جاگیروں کا ایک بڑا حصّہ وہ ہے جو انگریزی عہدِ اقتدار میں حکومتِ برطانیہ کی وفاداری اور فوجی خدمات کے صلہ میں حاصل کیا گیا ہے اور کچھ جاگیریں سکھوں کے عہدِ حکومت کی یادگار ہیں اور کچھ عہدِ مغلیہ کی۔ ان سب جاگیروں کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ اسلامی ریاست میں ان کو باقی رکھا جائے اس لیے حکومتِ اسلامی کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ایسی تمام جاگیریں

ان جاہ پرست اور ملّت فروش لوگوں سے چھین کر اہلِ استحقاق میں تقسیم کر دی جائیں۔

موجودہ انتقالِ آبادی اور مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلہ نے مملکتِ پاکستان کو جن اہم ذمہ داریوں سے دوچار کر دیا ہے ان کے پیشِ نظر اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ جلد از جلد موجودہ جاگیردارانہ سسٹم کو ختم کیا جائے اور اس کے بعد کمال دیانت داری سے ان زمینوں کی تقسیم کی جائے۔

نیز کسان اور زمیندار کا مسئلہ جو پاکستان کے کچھ علاقوں میں کافی اہمیت حاصل کر چکا ہے، جاگیرداری کی اصلاح سے ایک حد تک خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

مزارعت پر تحقیقی تبصرہ

دورِ حاضرہ میں مزارعت کا مسئلہ بہت کچھ اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اور آج ہر جگہ بحث و مذاکرہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مدنیت فاسدہ اور غیر عادلانہ نظام معیشت نے انسانوں میں دولتمند اور غریب، کارخانہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان کی طبقاتی تقسیم پیدا کردی ہے اور اعلیٰ طبقوں کے بہیمانہ مظالم نے ادنیٰ طبقوں میں بے پناہ جذبۂ انتقام پیدا کر دیا ہے۔

اس موقع پر ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، کہ آج معاشرہ کی اصلاح کے لیے جس ڈھنگ سے جدوجہد کی جا رہی ہے وہ اصلاحِ احوال کے بجائے گوناگوں پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے اور اس سے موجودہ طبقاتی خلفشار پہلے سے زیادہ ہولناک شکل اختیار کر رہا ہے۔ کیوں کہ ہر وہ کوشش جس کے بطن میں انتقامی رجحانات پرورش پا رہے ہوں اس کا قدرتی نتیجہ تخریب و فساد ہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک فریق کچھ عرصہ کے لیے دوسرے فریق کے آگے جھک جائے مگر اس کے ذہنی جذبات پہلے سے زیادہ شدّت اختیار کرتے جائیں گے اور آگے چل کر کسی ہولناک تصادم کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔

سوسائٹی کی اصلاح کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کے نظریاتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے۔ معاشرہ کی اصل فطرت کی ٹوہ لگائی جائے اور دیکھا جائے کہ اس کی تہہ میں کس طرح کے اصولِ حیات کارفرما ہیں، کیونکہ یہ بنیادی اصولِ حیات ہی معاشرہ کی رُوح ہوتے ہیں جو اس کی خارجی تشکیل کرتے ہیں۔ اگر آپ بیرونی ڈھانچہ کو بدل دیتے ہیں اور اس کی روح کو اسی حال میں چھوڑ دیتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اس کا دوسرا ڈھانچہ پہلے سے زیادہ بھیانک اور زہر آلود ہو۔

غرض مسئلہ مزارعت کی اہمیت چونکہ مدنیت حاضرہ کے پُرخطر مفاسد کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اسی نقطۂ نظر سے اس کا حل تلاش کرنا ہوگا۔

اصل بحث سے پہلے چند اصولی مقدمات کو بطور تمہید بیان کرنا ضروری ہے۔

اسلامی معاشرہ کے خصائص طبعی

اسلام ایک ایسے معتدل اور متوازن معاشرہ کی تخلیق کرتا ہے جو اصل فطرت کے لحاظ سے بالکل الگ مزاج رکھتا ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام شعبوں میں یکساں طور پر کیفیت اعتدال پائی جاتی ہے۔ تہذیب و ثقافت سے لے کر سیاست و معیشت تک یعنی تمام ذہنی اور خارجی شعبہ ہائے زندگی میں حیرت انگیز توازن قائم رکھتا ہے۔

قرآن حکیم سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جب کوئی انسانی جماعت صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتی ہے۔ یعنی اس کے فکر و عمل میں کجی اور ناہمواری

پیدا ہو جاتی ہے تو خدائے قدوس ارسال رسل اور انزال کتب کے ذریعہ
از سرِ نو اس میں توازن و اعتدال پیدا کرتا ہے۔

اللہ الذی انزل الکتاب والمیزان	اللہ وہ ہے جس نے کتاب اور میزان
(الشوریٰ)	اُتاری۔

"المیزان" کا مادّہ وزن ہے اور اس کے لغوی معنی آلۂ وزن کے ہیں۔
قرآنی اصطلاح میں المیزان سے مراد "الکتاب" کی خارجی اور عملی تفسیر ہے
یعنی انبیا علیہم السّلام کی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ!
انبیا کرام کے اسوۂ حسنہ کو المیزان سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ اس کی
دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ اس سے کتاب اللہ کے معانی و حقائق کو مشہود شکل
میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ
حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں میں ربط و توازن رونما ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ
حدید کی اس آیت میں دوسرے معنی ہی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

ولقد ارسلنا بالبینات و انزلنا معھم	بلاشبہ ہم نے اپنے رسول دلائل و بینات
الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط	کے ساتھ بھیجے ہیں اور ہم نے ان کے ہمراہ
(الحدید)	کتاب اور میزان اتاری ہے تاکہ لوگ راہِ
	اعتدال پر قائم ہو جائیں۔

اس آیت میں "القسط" کو کسی ایک ہی شعبۂ زندگی سے مخصوص کرنا
یقیناً غلط ہے۔ دراصل یہ تمام ذہنی اور عملی شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہے یعنی ارسال
رسل اور انزال کتب کا مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرہ نقطۂ عدل

پر کھڑا ہو جائے۔ اس میں فکر و ذہن کی کجی، اعمال کی ناہمواری اور نا مساوات باقی نہ رہے۔

اس موقع پر اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اسلام کے نزدیک مساوات کا معیار بالکل جدا ہے۔ عام طور پر مساوات کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کے تمام افراد معاشرتی اور معاشی لحاظ سے بالکل برابر ہو جائیں اور ان میں کسی طرح کا تفاوت باقی نہ رہے۔ مگر اس طرح کی مساوات عملی زندگی میں کبھی نہ پیدا ہو سکی ہے اور نہ ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ انسانوں کی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں میں فطری طور پر اختلاف پایا جاتا ہے اور عملی زندگی میں انسان کی یہ صلاحیتیں ہی کام کرتی ہیں۔ ایک شخص اپنی استعداد طبعی کی مدد سے مشکل سے مشکل کام کو قلیل ترین مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتا ہے اور دوسرا اس استعداد سے محروم ہونے کی وجہ سے سالہا سال میں بھی اتنا کام نہیں کر سکتا۔ ایک کی دماغی صلاحیت کا یہ حال ہے کہ وہ پانی سے برقی لہریں پیدا کر سکتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو اس کے دماغی کارنامہ کو سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ظاہر ہے کہ عملی زندگی میں ان دو انسانوں کو ایک ہی درجہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی ان کی دماغی اور جسمانی صلاحیتوں کے نتائج یکساں ہو سکتے ہیں اور اس فطری تفاوت کے علی الرغم جو مساوات قائم کی جائے گی وہ معاشرہ کی صحت مندانہ نشوونما کو روک دے گی۔ لہٰذا اس فطری اختلاف کی بنا پر معاشی زندگی میں جو تفاوت رونما ہوتا ہے وہ فطرت کا اقتضا ہے اور اسلام چونکہ قانونِ فطرت ہی کا دوسرا نام ہے اس لیے وہ معاشی تفاوت سے

انکار نہیں کرتا ۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ ۔	ہم نے حیات دنیوی میں ان کی معیشت کو ان میں تقسیم کر دیا ہے اور کچھ لوگوں کو مرتبہ کے لحاظ سے دوسروں پر بلند کیا ہے ۔

مگر اس کے باوجود اسلام حصولِ دولت اور صرفِ دولت پر سخت گیرانہ محاسبہ کرتا ہے ۔ یعنی اسلامی سوسائٹی میں کسی شخص کو یہ جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ غصب و نہب، رشوت ستانی، بد دیانتی یا دوسرے ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرے یا دولت کو یونہی عیاشیوں میں صرف کرے ۔

من این اکتسبتم و فیما انفقتم ۔ (بخاری)	تم نے مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا ؟

یعنی اسلام نے حصولِ دولت پر جو پابندیاں عائد کی ہیں اور پھر اس کے صرف کے لیے جو مصارف متعین کیے ہیں اس کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص بہت زیادہ مالدار ہو ہی نہیں سکتا ۔ اور جس حد تک وہ جائز ذرائع سے دولت فراہم کرتا ہے وہ تدریجی طور پر دوسروں میں تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے اور اس طرح افراد کی دولت بالآخر ریاست و مملکت ہی کے کام آتی ہے لیکن تقسیمِ دولت کا یہ طریقہ معاشرہ کے ذہنی ارتقا کے ساتھ وابستہ ہے اس لیے اس کو قدرتی طور پر پائدار اور محکم ہونا چاہیئے ۔ لیکن کمیونزم نے تقسیمِ دولت کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ غیر طبعی غیر فطری اور جبری ہے ۔ اس لیے اس سے

وہ خوشگوار نتائج کبھی نہیں پیدا ہو سکتے بلکہ اس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ نیز اسلامی معاشرہ میں جو اخلاقی روح کار فرما ہوتی ہے اس کی وجہ سے معاشی تفاوت و اختلاف افراد کی معاشرتی مساوات پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ایک آقا ہے اور دوسرا غلام ہے۔ مگر آقا کو محض اس وجہ سے کوئی شرف حاصل نہیں ہے کہ وہ آقا ہے۔ اور غلام محض اس لیے کمتر اور ذلیل نہیں ہے کہ وہ غلام ہے۔ آقا میں احساس برتری نہیں ہے اور غلام میں احساس کمتری نہیں ہے۔ غلام اپنے آقا کو کنبے کا مساوی رکن تصور کرتا ہے اور آقا اس کو دینی بھائی سمجھتا ہے۔

بل اخوانکم فی الدین (بخاری) یہ غلام تمہارے دینی بھائی ہیں۔

غرض اسلام میں معاشی تفاوت کے باوجود باہم تعاون و اعتماد کی حیرت انگیز روح کار فرما ہوتی ہے۔ نیز قانونی اور معاشرتی لحاظ سے اعلیٰ اور ادنیٰ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔

زمین کی ملکیت کا تصور

اسلام کے نزدیک پوری کائنات کا مالک حقیقی خدا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (آیہ) آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ کی ہے۔

اور زمین بھی اسی زمرہ میں شامل ہے لیکن انسانوں کی ملکیت کا مفہوم حق انتفاع کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی جو شخص کسی چیز کے انتفاع میں دوسروں کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے۔ وہ اس چیز کا مالک متصور ہوتا ہے۔ جیسے ایک شخص کسی زمین پر دوسرے لوگوں سے پہلے قابض ہو جاتا ہے۔ اس کے

لیے یہ اصول بنا دیا گیا ہے کہ وہ اس کا مالک متصور ہوگا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو باہم نزاع و اختلاف اور خودغرضانہ مسابقت سے معاشرہ میں خطرناک فساد رونما ہو جاتا۔

امام ولی اللہ لکھتے ہیں:

والارض کلہا فی الحقیقۃ بمنزلۃ مسجد او رباط جعل وقفاً علی ابناء السبیل وھم شرکاء فیہ فیقدم الاسبق فالاسبق ومعنی الملک فی حق الآدمی کونہ احق بالانتفاع من غیرہ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص۱۰۳)

اور ساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی طرح ہے جو مسافروں پر وقف کی جاتی ہے اور وہ اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ پس جو شخص پہلے آکر مسجد یا سرائے کی کسی جگہ پر قابض ہو جاتا ہے وہ اس کے انتفاع کا حق دار ہوتا ہے۔ آدمی کے حق میں ملک کے معنی یہی ہیں کہ وہ دوسروں کی نسبت انتفاع کا زیادہ حقدار ہے۔

مسئلہ مزارعت اور احادیث و آثار

مزارعت کے مسئلہ میں ابتدا ہی سے اختلاف چلا آتا ہے۔ کچھ احادیث مرفوعہ اس کے عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں اور دوسری احادیث و آثار سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ ہم پہلے ان دو قسم کی احادیث و روایات کو یہاں نقل کرتے ہیں:

عدم جواز کی احادیث

عن ابی النجاشی مولی رافع ابن خدیج سمعت رافع بن خدیج بن رافع عن عم ظہیر بن رافع

لقد نهانا رسول الله صلی الله علیه وسلم عن امر کان بنا رافقاً قلت ما قال رسول الله فهو حق قال دعانی رسول الله صلعم قال ما تصنعون بمحاقلکم قلت نؤاجرها علی الربیع من التمر والشعیر قال لا تفعلوا ازرعوها او ازرعوها او امسکوها قال رافع قلت سمعاً وطاعة" (بخاری)

ظہیر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمکو ایسے امر سے منع کیا جو ہمارے لیے رفق و آسانی کا باعث تھا۔ میں نے کہا جو رسول اللہ نے فرمایا ہے وہ حق ہے، ظہیر نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلعم نے بلا کر فرمایا تم اپنی زمینوں کا کیا کرتے ہو، میں نے عرض کیا کہ ہم جداول کی پیداوار یعنی کھجور اور جو کی شرط پر اپنی زمین دیتے ہیں، فرمایا ایسا مت کرو۔ تم خود اس کی کاشت کرو یا اجارہ پر دو یا اس کو روک رکھو۔

عن عطاء جابر قال کانوا یزرعونها بالثلث والربع والنصف فقال النبی صلعم من کانت له ارض فلیزرعها او لیمنحها فان لم یفعل فلیمسك ارضه

عن ابی هریرة بلفظ فلیمنحها اخاه فان ابی فلیمسك ارضه

حضرت جابر کہتے ہیں کہ صحابہ تہائی، چوتھائی اور نصف پر کاشت کے لیے زمین دیتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو وہ خود کاشت کرے یا وہ زمین دوسرے کو بخش دے۔ پس اگر ایسا نہ کرے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔ پس وہ اپنے بھائی کو دیدے اگر وہ انکار کرے تو پھر زمین کو روک رکھے۔

عن رافع بن خدیج قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن المحاقلة والمزابنة قال انما یزرع ثلثة رجل له ارض ورجل منح ارضاً ورجل اکتری ارضاً

رسول اللہ صلعم نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ صرف تین آدمی زراعت کا کام کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جس کی اپنی زمین ہو۔

بمذهب او فضة - (اخرجه ابوداود و نسائی) دوسرا وہ جس کو زمین بخش دی گئی ہو - اور تیسرا وہ جس نے سونے یا چاندی کے بدلہ میں زمین کو کرایہ پر دیا ہو -

جواز مزارعت کی احادیث اور آثار صحابہ

عن نافع ان عبداللہ بن عمر اخبرہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عامل خیبر بشطر ما یخرج منها من ثمر او زرع (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ کیا اہل خیبر سے میوہ اور کھیتی کی پیداوار کے ایک حصہ پر -

ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے -

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یحرم المزارعة

(بحوالہ فتح الباری جلد ۵ صہ ۱۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو حرام نہیں کیا

قال الحسن لا بأس ان تکون الارض لاحدهما فینفقان جمیعاً فما خرج فهو بینهما ورای ذالك الزهری - (بخاری)

حسن کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ایک کی زمین ہو اور دونوں فریق اس سے فائدہ اٹھائیں اور جو کچھ پیداوار ہو وہ دونوں میں تقسیم ہو - زہری کا بھی یہی خیال ہے -

قال قیس بن مسلم عن ابی جعفر قال ما بالمدینة اهل بیت هجرة الا یزرعون علی الثلث والربع وزارع علی وسعد بن مالك وعبداللہ بن مسعود وعمر بن عبدالعزیز والقاسم وعروة بن الزبیر وآل ابی بکر

مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہیں جو زمین کو تہائی اور چوتھائی پر زراعت کے لیے نہ دیتا ہو علی رض سعدؓ بن مالک عبداللہ بن مسعود عمر بن عبدالعزیزؒ قاسم عروہ بن زبیر آل ابی بکر آل علی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم (یہ تمام حضرات) مزارعت کے

وقال علی وابن سیرین (بخاری) طور پر زمین دوسروں کو دیتے تھے۔

حدثنا علی بن عبداللہ حدثنا سفیان قال

عمرو قلت لطاؤس لو ترکت المخابرة — عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس سے

فانھم یزعمون ان النبی صلعم نھی عنہ — کہا کاش کہ میں مزارعت کو چھوڑ دیتا کیوں کہ لوگ

یہ خیال کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

قال عمرو انی اعطیھم واعینھم وان اعلمھم — عمرو نے کہا کہ میں لوگوں کو دیتا ہوں اور ان کی مدد کرتا

اخبرنی یعنی ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ — ہوں اور صحابہ میں سے بڑے عالم (ابن عباسؓ) نے

وسلم لم ینہ عنہ ولکن قال ان یمنح اخاہ خیر — مجھے خبر دی ہے کہ نبی صلعم نے اس سے منع نہیں کیا البتہ

لہ من ان یاخذ علیہ خرجاً معلوماً۔ — انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اپنے بھائی کو یونہی بخش دینا

(بخاری) — اس سے بہتر ہے کہ وہ پیداوار کا ایک حصہ لے۔

یہاں اس بات کا اظہار غیر ضروری نہ ہوگا کہ آئمہ اربعہ میں سے صرف امام ابوحنیفہ مزارعت کے عدم جواز کے قائل ہیں اور جمہور کے نزدیک مزارعت ایک جائز معاملاتی عقد ہے۔ امام ابوحنیفہ اول الذکر احادیث سے استناد کرتے ہیں اور جمہور موخر الذکر احادیث و آثار کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں اور پھر ہر ایک فریق دوسرے فریق کی احادیث کی تاویل کرتا ہے، اس مختصر مضمون میں ان تاویلات کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ باتیں کتب حدیث اور کتب فقہ میں تفصیلی طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہم اس موقع پر شخصیتوں سے قطع نظر صرف اصولی بحث پر ہی اکتفا کریں گے۔

استناد بالحدیث کا اصولی طریق کار

جب متعارض حدیثیں کسی مسئلہ میں وارد ہوں تو وہاں ایک

اصولی طریق کار یہ ہے کہ کتاب اللہ کے اصول کلیہ اور عام اسلامی نظریات کی روشنی میں ان متعارض احادیث کا جائزہ لیا جائے اور پھر جو احادیث ان اصول عامہ سے مطابقت رکھتی ہوں ان کو اختیار کر لیا جائے اور دوسری احادیث (اگر وہ سند کے اعتبار سے لائق اعتماد ہوں) کی مناسب تاویل کی جائے۔

یہ طریق استناد اس اصل پر مبنی ہے کہ حدیث در اصل کتاب اللہ کی تفسیر و تعبیر کا درجہ رکھتی ہے اور تعبیر اسی وقت قابل قبول ہو سکتی ہے کہ وہ معبر عنہ سے مطابقت رکھتی ہو۔

استناد بالحدیث کی ایک دوسری اصل جس کو بہت سے فقہا و محدثین نے قبول کیا ہے یہ ہے کہ جب ایک طرف ایسی حدیثیں ہوں جو مفہوم کلی کو ظاہر کرتی ہوں اور دوسری طرف ایسی روایات ہوں جو خاص واقعات کی ترجمانی کرتی ہوں تو اس صورت میں اول الذکر قسم کی احادیث ہی لائق استناد ہو سکتی ہیں۔

اب ان اصول استناد کی روشنی میں ان احادیث کا جائزہ لینا چاہیے جو مزارعت کے باب میں وارد ہوئی ہیں۔

اصول قرآنی ہم ابتدا بحث میں ملکیت زمین کا اسلامی تصور متعین کر چکے ہیں یعنی زمین کی ملکیت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ مالک کو حق انتفاع حاصل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ حق انتفاع اس کو کیسے حاصل ہوا؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اسکا جواب بالکل واضح ہے کہ اس نے محنت اٹھا کر غیر آباد زمین کو آباد کیا ہے اور اس کی محنت کی وجہ سے اس کو یہ حق حاصل ہوا ہے یعنی اصل چیز جو کچھ ہے وہ محنت ہے۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن - (آیہ) — مردوں کے لیے مال و رزق کا وہ حصہ ہے جس کو انھوں نے کسب و محنت سے حاصل کیا اور عورتوں کے ملک میں وہ حصۂ مال ہے جس کو انھوں نے حاصل کیا۔

لیس للانسان الّا ما سعی (۵۳) انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کو وہ سعی و محنت سے حاصل کرتا ہے۔

ذیل کی احادیث صحیحہ میں اسی اصل کو واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔

عن عمرو بن عوف عن النبی صلعم قال من احیی ارضاً میتةً فھی لہ (اخرجہ الترمذی عن ہشام)	جو شخص زمین کو زندہ کرے وہ اس کا مالک متصور ہوگا۔
من احیا ارضاً میتةً فھی لہٗ	جو شخص بنجر زمین کو آباد کریگا وہ زمین اس کی ہوگی۔
عن عائشة عن النبی صلعم من اعمر ارضاً لیست لاحد فھو احق۔	جو شخص کسی ایسی زمین کو آباد کرتے جو کسی کی مملوکہ نہیں ہے تو وہ آباد کرنے والا اس کا زیادہ حقدار ہے۔
عن عمر قال من عطل ارضاً ثلث سنین لم یعمرھا فجاء غیرہ فعمرھا فھی لہٗ	جو شخص زمین کو تین سال تک معطل چھوڑ دے اور دوسرا اگر اسکو آباد کرے تو یہ آباد کرنیوالا ہی اس کا مالک ہوگا

ان نصوص کتاب و سنت سے ذیل کے اصولِ عامّہ مفہوم ہوتے ہیں:

(۱) غیر آباد زمین کو آباد کرنے سے حقوقِ انتفاع حاصل ہوتے ہیں۔

(۲) جبتک وہ زمین کو آباد رکھتا ہے اسوقت تک وہ اس کا مالک (بمعنی مذکور) متصور ہوتا ہے

(۳) اگر زمین کو معطل چھوڑ دیتا ہے تو وہ خود بخود ہی اس کے حقِ ملکیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

احادیث کا جائزہ | ان اصولِ کلیہ کی روشنی میں ان تمام احادیث کا جائزہ لیا جا سکتا ہے جن کو دونوں فریق بطور سند پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن احادیث کو مزارعت کے عدمِ جواز کے لیے پیش کیا جاتا ہے وہ صرف اسوجہ سے ہی لائقِ ترجیح نہیں ہیں کہ وہ مرفوع ہیں بلکہ اسلیے بھی وہ ترجیح و اختیار کی مستحق ہیں کہ وہ قرآنی اصولِ کلیہ سے مطابقت رکھتی ہیں یعنی اس صورت میں صرف وہی شخص زمین پر قابض رہ سکتا ہے جو خود اس کو آباد کرے اور اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اتنی زیادہ زمین پر قبضہ کر لے جس کو وہ خود کاشت نہ کر سکے۔ قرآنی الفاظ

بیں زمین انسان کے لیے "متاع" ہے۔ یعنی اس سے تمتع ہی کیا جا سکتا ہے اور اس کا مالک حقیقی صرف خدا ہے۔ اس لیے ایک شخص اتنی ہی زمین پر قابض رہ سکتا ہے جو اس کے تمتع کے لیے کافی ہو سکتی ہو اور جتنی زمین اس مقصد سے زائد ہوگی وہ دوسرے کا حق ہے چنانچہ یہ احادیث بھی اسی مفہوم کو پیش کر رہی ہیں۔

آپ دوبارہ ان الفاظ پر غور کریں:

ازرعوھا او ازرعوھا او امسکوھا — خود اس کی کاشت کرو یا دوسروں کو کاشت کیلئے اجارہ پر دے دیا اس کو روک رکھو۔

من کان لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا فان لم یفعل فلیمسک ارضہ ۔ — جس کے پاس زمین ہو وہ خود اس کی کاشت کرے یا کسی دوسرے کو بخشدے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما یزرع ثلثۃ (مرا محدیث)

ان احادیث کا مقصد بالکل ظاہر ہے کہ جس کے پاس زمین ہو تو خود اس کی کاشت کرے یا دوسرے بھائی کو بخشدے۔ اگر وہ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرتا تو پھر فلیمسک ارضہ کے الفاظ سے اسکو متنبہ کیا ہے کہ پھر اس زمین کو اپنے پاس روک رکھے یہاں تک کہ حکومت اسلامی قانون کی طاقت سے یہ زمین اس سے چھین کر دوسرے کے حوالے کر دے لہ

بہرحال عدم جواز کی احادیث معاشرۂ انسانی کے اعتدال و توازن اور ملکیت زمین کے قرآنی تصور سے ہم آہنگ ہیں اور پھر علاوہ اسکے یہ احادیث اصولِ کلیہ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مگر جوازِ مزارعت کی احادیث محض جزوی واقعات یا تعامل صحابہ کو ظاہر کرتی ہیں۔

احادیث جواز کا صحیح جواب مزارعت کے جواز کے بارے میں جس قدر آثار کتب حدیث

لہ حضرت عمر نے اس کی مدت تین سال متعین کی ہے۔ کیونکہ تین سال کاشت نہ کرنے سے زمین پہلی حالت پر آجاتی ہے۔ اس مدت کے بعد حکومت یہ زمین دوسرے کو دلا سکتی ہے۔

میں ملتے ہیں ان میں عمیق نگاہ کرنے سے ذہن اس بات کی طرف جاتا ہے کہ دور رسالت سے پہلے عرب میں مزارعت کا عام رواج تھا۔ چنانچہ عدم جواز کی احادیث سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے کچھ صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم اپنی زمینوں کا کیا کرتے ہو؟ صحابہ نے جواب دیا کہ ہم نصف یا تہائی پر دوسروں کو کاشت کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ تو آپ نے اس سے منع فرمایا۔ مگر یہ احادیث نہی عام مسلمانوں تک نہ پہنچ سکیں اور وہ بدستور سابق عقد مزارعت کے ذریعہ نسیبوں کا کاروبار چلاتے رہے اور ایک طبقہ میں یہ بات کا بھی چرچا ہوتا رہا کہ آنحضرت صلعم نے مزارعت سے منع فرمایا ہے۔ عمرو بن دینار کے ان الفاظ سے اسکی تائید ہوتی ہے۔

قال عمرو فقلت لطاؤس لو ترکت المخابرۃ فانهم یزعمون ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نهی عنه۔

عمرو بن دینار نے طاؤس سے کہا کاش کہ میں مزارعت کو چھوڑ دیتا۔ کیونکہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عبداللہ بن عمر کی یہ روایت اس سے زیادہ واضح ہے عن ابن عمر قال کنا نخابر ولا نری بذالک باسا حتی زعم رافع بن خدیج ان رسول اللہ صلعم نهی عنه فترکنا (اخرجہ مسلم) عبداللہ بن عباس نے احادیث نہی کی جو تاویل کی ہے وہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ اور عبداللہ بن عمر کی روایت میں یہود خیبر کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بالکل الگ نوعیت رکھتا ہے یعنی ان سے جو کچھ لیا جاتا تھا وہ جزیہ کے طور پر تھا۔

مزارعت اور مضاربت میں فرق جمہور نے مزارعت کو مضاربت پر قیاس کیا ہے لیکن یہ قیاس، قیاس مع الفارق ہے۔ مضاربت میں ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور دوسرے کی محنت۔ اور اس میں نفع اور نقصان کا احتمال ہے، اگر تجارت میں نقصان ہو جائے تو صاحب مال کو یہ نقصان برداشت کرنا ہے۔ لیکن مزارعت میں زمین کے نقصان کا احتمال ہی نہیں ہے۔ اس میں مالک کے لیے بہر حال نفع اس لیے عقد مزارعت مضاربت سے ہرگز مشابہ نہیں ہے بلکہ معاملہ سود سے زیادہ مشابہ ہے۔

موجودہ زمینداروں کی مالکانہ حیثیت

ان تصریحات کے بعد موجودہ زمینوں کا جائزہ لینا چاہئے کہ ان کے مالکوں کی مالکانہ حیثیت کیا ہے۔ ہم ان زمینوں کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) وہ زمینیں جو جاگیر کے طور پر کسی حکومت نے لوگوں کو دی ہیں اور پھر جاگیرداروں نے یہ زمینیں مزارعت کے طور پر دوسروں کو دے رکھی ہیں۔

(۲) وہ زمینیں جن پر شروع میں لوگوں نے قبضہ کیا تھا۔ مگر یہ قبضہ اسطرح ہوا کہ انھوں نے بہت بڑے رقبہ کی حدود پر نشان لگا لیے اور انھوں نے خود مشقت اٹھا کر ان زمینوں کو آباد نہیں کیا۔

(۳) جو زمینیں قیمت سے خریدی گئی ہیں اور اس طرح خریدنے والے لوگ زمینوں کے مستقل مالک بنے۔ یا شروع میں ان کے آباء اجداد نے بذات خود اس زمین کو آباد کیا تھا۔

پہلی قسم کے زمینداروں کے متعلق جاگیرداری کی بحث میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ جاگیریں قطعی ناجائز ہیں اور اب حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے قبضہ میں لا کر مصالح عامہ کے پیش نظر ان کو تقسیم کرے۔

دوسری قسم کی زمینوں کا قبضہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ قبضہ صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے کہ مالک نے خود محنت کر کے غیر آباد زمین کو آباد کیا ہو۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ یہ لوگ محض نشان لگانے (تحجیر) سے بڑے بڑے رقبوں پر قابض ہو گئے تھے اور اسکے بعد دوسرے لوگوں سے یہ زمینیں آباد کرائی گئیں۔ ظاہر ہے کہ ان زمینوں کے اصل مالک وہی لوگ ہیں جنھوں نے محنت کر کے ان زمینوں کو آباد کیا۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو آج مزارعین کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم کی زمینوں کی ملکیت جائز ہے لیکن نصوص کتاب و سنت کے پیش نظر زمین کسی کے پاس رہنے نہ دی جائے جس کو وہ یونہی معطل چھوڑے رکھے اس لیے یہ جائز ہے کہ وہ عقد مزارعت کے ذریعہ دوسروں سے کاشت

وآخر دعوانا ان الحمد للہ